ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ ۔ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
اکتوبر ۔ دسمبر ۲۰۱۳ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

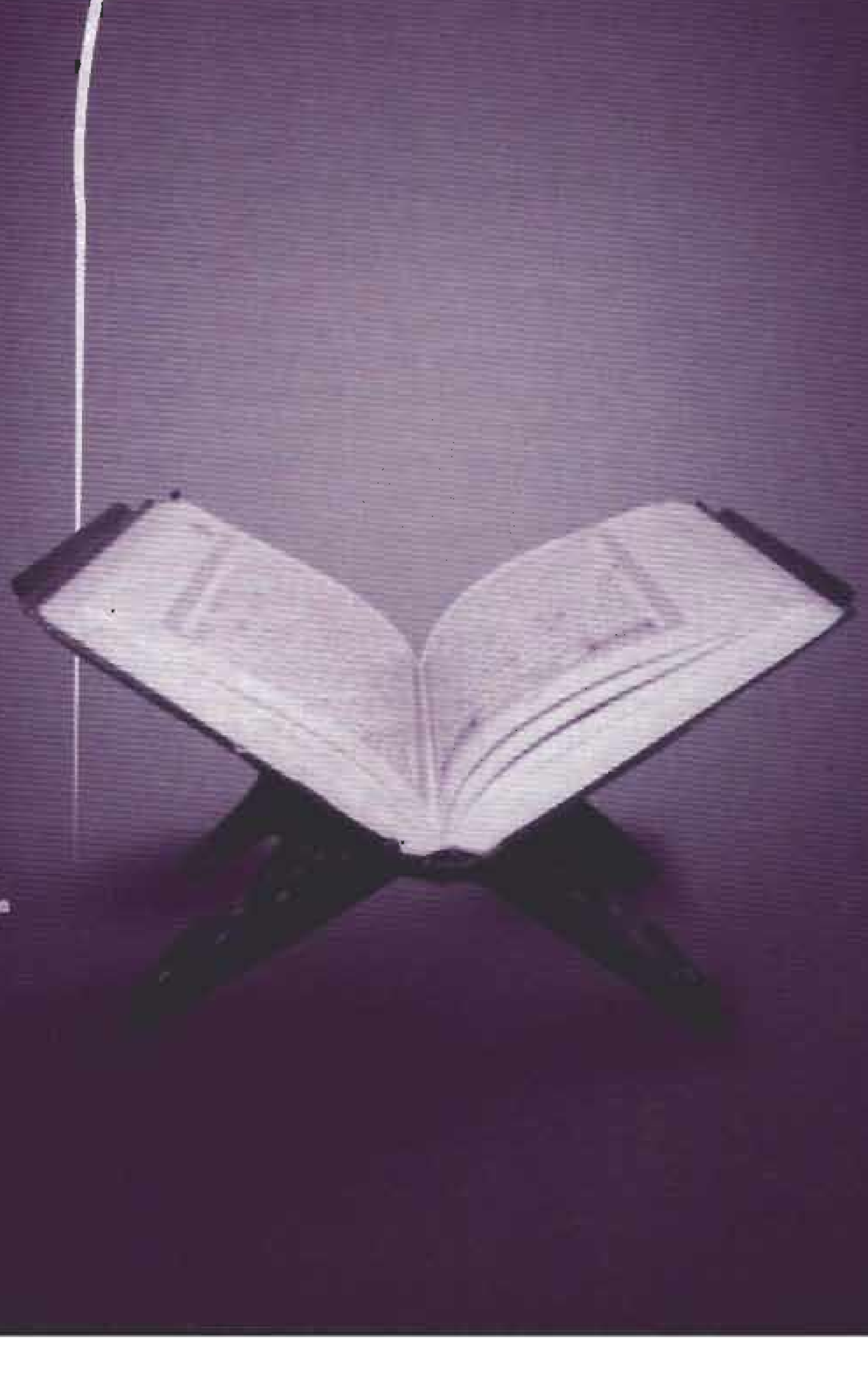

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصّہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت 450 روپے

حصّہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصّہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصّہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 460 روپے

حصّہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 550 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ آفسٹ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۲ شمارہ ۴

ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ۔ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل : publications@tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون : 200 روپے ، فی شمارہ : 50 روپے

اس شمارے میں

حرفِ اوّل

اسلام اور سیکولرزم	ڈاکٹر ابصار احمد	3

مضامینِ قرآن

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	11

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افادات حافظ احمد یارؒ	22

نقوشِ سیرت

سیرتُ النّبی ﷺ کا ایک اہم واقعہ: غزوۂ اَحزاب	محمد انس حسان	31

فکر و نظر

حدیث اور مستشرقین (۴)	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر	55

اقبالیات

تعمیرِ خودی (۱)	مدثر رشید	69

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	88

بیانُ القرآن

		96

Dr. Israr Ahmad MESSAGE OF THE QURAN

اسلام اور سیکولرزم

’اسلام اور سیکولرزم‘ کے عنوان پر راقم کا ایک مضمون کم وبیش رُبع صدی قبل ’حکمت قرآن‘ میں شائع ہوا تھا‘ جو راقم نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے زیرِاہتمام خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی یاد میں منعقدہ سیمینار میں پڑھا تھا۔ سال رواں کی دوسری سہ ماہی کے شمارے کے لیے ’’اسلام اور سیاسی ہیئت حاکمہ‘‘ کے عنوان سے کچھ افکار نوکِ قلم سے صادر ہو کر اشاعت پذیر ہوئے۔ بعض احباب نے اول الذکر مضمون کی تعریف کرتے ہوئے خط لکھے اور اسے دوبارہ شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پرانی فائل سے جب یہ مضمون نکال کر دوبارہ دیکھا تو خود مجھے مناسب لگا کہ اسے دوبارہ شاملِ اشاعت کرنا چاہیے تاکہ ایک ہی سال (۲۰۱۳ء) کی جلد میں نفسِ مضمون کی مناسبت رکھنے والی یہ تحریریں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ اس تحریر کے اہم نکات کو بارِدگر نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں اس مختصر تحریر کی تحریک مرحوم پروفیسر وارث میر صاحب کے ’نویدِ فکر‘ کے عنوان سے ایک مؤقر روزنامہ میں چھپنے والے مضامین تھے‘ جو اُس وقت بقیدِ حیات تھے اور ان سے ان موضوعات پر بحث وتمحیص ہوتی رہتی تھی۔

اہلِ علم کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ مختلف تہذیبی‘ علمی اور ثقافتی الفاظ وتصورات ایک خاص روایت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص زبان سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور بالعموم ان کا مفہوم کسی دوسری زبان کے ایک لفظ میں کاملتاً منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر اصطلاحات کے معانی ومفاہیم مختلف مباحث کے پس منظر (context) میں یکساں نہیں رہتے۔ اور یہ حقیقت مختلف تہذیبوں اور نظامہائے افکار کے تقابلی مطالعے میں بدرجۂ اَتم واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

میں اس مقالے میں قدرے تفصیل سے اس امر کا جائزہ لوں گا کہ ’’ریلیجن‘‘ یعنی مذہب اور ’’سیکولرازم‘‘ کے الفاظ اور ان کے جملہ مفاہیم کی کیفیت اسلام کے بنیادی اصول وفکر کے حوالے سے کیا رہتی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ آج کل بعض اصحابِ علم اور دانشور کن مغالطوں کا شکار ہو کر اسلام اور سیکولرزم کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بالکل غلط طور پر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے افکار اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ (۱)

’’ریلیجن‘‘ اور ’’سیکولرازم‘‘ کی مغربی فکر میں دوئی اور کسی حد تک نظری وفکری مخاصمت میرے خیال میں ناقابلِ تردید حد تک واضح ہے۔ ’’سیکولرازم‘‘ کی جو تعریف انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھِکس مطبوعہ ۱۹۰۵ء (ایڈیٹر‘ جیمز ہسٹینگز) میں دی گئی ہے‘ اس کے مطابق انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں پیدا

(۱) مثلاً پروفیسر وارث میر مرحوم اپنے سلسلۂ مضامین ’نویدِ فکر‘ میں سیکولرازم اور جدیدیت کی حمایت کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کو اپنا مؤید اور ہم خیال تصور کرتے تھے۔

ہونے والی اس فکری تحریک کے پس پردہ مخصوص سیاسی اور فلسفیانہ محرکات تھے۔ اس کا نقطۂ نظر مذہب کے بارے میں اکثر و بیشتر منفی رہا ہے۔ انسانی زندگی اور ضابطہ حیات کے بارے میں یہ ایک مکمل نظریہ ہے جس میں مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی معتقدات کی بجائے اصل زور مادی وسائل اور انسانی سوچ پر ہے۔ اگرچہ انگلستان میں اس نقطۂ نظر اور ''سیکولرازم'' کی اصطلاح کو رواج دینے والے سیاسی اور سماجی کارکن جارج جیکب ہولی اوک (۱۸۱۷۔۱۹۰۶ء) کی کوشش تھی کہ اس فکر کو صرف سماجی خوشحالی' مادی ترقی اور سیاسی آزادی کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے اور عیسائیت دشمنی کو اس کا لازمی عنصر نہ خیال کیا جائے۔ لیکن اس کے بعض اہم رفقاء بالخصوص چارلس بریڈلا' چارلس واٹس اور جی ڈبلیو فٹ مذہبی عقائد کی تردید پر مُصر تھے۔ اور مادی ترقی اور دنیوی خوشحالی کے لیے ابطالِ مذہب اور الحاد کو ضروری تصور کرتے تھے۔ اس تحریک سے وابستہ افراد کا بنیادی فکر یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کا تعلق دو علیحدہ اور مختلف دنیاؤں سے ہے۔ سائنس ہمیں اس مادی دنیا کا علم دیتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز یا ہر وہ علم جس کا تعلق اس آب وگل کی دنیا سے ہے' سیکولر ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ مختلف علوم' انسانی مشاہدات و تجربات اور عقل وخرد کی بنیاد پر زندگی کا لائحہ عمل طے کرے اور سیاسی و معاشرتی نظام وضع کرے۔ سماجی و معاشرتی قوانین کا پہلو پہلے بھی عیسائیت میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رفعِ عیسیٰؑ کے بعد جلد ہی پال نے قوانین کو تعلیماتِ عیسیٰؑ سے بالکلیہ خارج اور ساقط کر دیا تھا اور مذہب کو صرف چند ناقابلِ فہم عقائد (Dogmas) تک محدود کر کے عملی زندگی' اخلاق اور قانون سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا۔ چنانچہ اگر دقّتِ نظر سے دیکھا جائے تو تاریخی طور پر مذہبی' یا 'دیلیجئس' اور دنیوی یا 'سیکولر' کی تقسیم دنیائے عیسائیت میں پہلے ہی موجود تھی۔ گزشتہ صدی کی سیکولرسٹ تحریک نے اسے زیادہ علمی اور سائنٹیفک انداز میں زوردار طریقے سے پیش کیا۔ اس میں جہاں ایک طرف سیاسی جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی' وہاں دوسری جانب مذہب اور مذہبی اندازِ فکر کی بجائے انسانی فکر اور سائنسی منہاج کو دنیوی معاملات و مسائل کے حل و کشود' ترقی اور سماجی بہتری کے حصول کی کلید قرار دیا گیا۔ اگرچہ سیکولر تحریک سے منسلک اکثر مفکرین نے وجودِ باری تعالیٰ' آخرت اور دوسرے مذہبی عقائد کی علمی طور پر تردید نہیں کی' لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ انہوں نے ان معتقدات کو مثبت طور پر لائقِ اعتناء اور غور وفکر کے قابل بھی نہ جانا۔ اور یہ عدم توجہی کا رویہ بھی بڑی حد تک مذہب کی نفی پر منتج ہوا۔

ایک اہم یورپی مفکر C.A. Van Peursen نے سیکولرازم کے نقطۂ نظر پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس کے تین اہم عناصر یا نکات کی نشاندہی کی ہے' جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. *Disenchantment of Nature*
2. *Desacralization of Politics*
3. *Deconsecration of Values*

پہلے عنصر کے مطابق کائنات کسی مافوق الفطرت ہستی کی پیدا کردہ نہیں اور نہ ہی اسے کسی الوہی ہستی سے وابستہ سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے نکتے میں سماجی اور سیاسی مسائل اور قوانین کی مذہبی تقدس سے علیحدگی' اور

تیسرے نکتے میں اَقدار اور بالخصوص اَخلاقی اقدار کا بالکلیہ انسانی پسند و ناپسند پر انحصار اور خیر و شر کے مذہبی عقائد سے لاتعلق ہونا بیان کیا گیا ہے۔

گزشتہ صدی میں انگریز مفکر چارلس بریڈلا اور اس کے ساتھیوں کی الحاد پسندی اور اس صدی کے فلسفی ادیب وان ہیورسین کی مندرجہ بالا تصریحات کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ پروفیسر وارث میر صاحب کے اس خیال میں کہ ''یہ امر واقعی ہے کہ مغرب میں اس اصطلاح سے مذہب دشمنی یا لادینیت کبھی بھی مراد نہیں لیا گیا''(۱) کیا صداقت رہ جاتی ہے۔ اسلام' اس کے بنیادی معتقدات اور اساسی فکر کا شعور رکھنے والے ہر شخص کے لیے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ''ریلیجن'' اور ''سیکولرازم'' کے الفاظ اور ان کے مخصوص معانی جو یورپی فکر اور زبانوں سے مختص ہیں' اسلام' عربی اور اسلامی علمی ذخیرے میں قطعاً نہیں پائے جاتے۔ یہ صرف مغربی تعلیم کا اثر اور مغربی تصورات کی سحر کاری ہے کہ ہمارے ملک کے بعض دانشور اور صحافی حضرات بھی اسلام کی وحدت میں مذہب اور سیکولر رویّے کی دوئی کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہب کا صرف ایک انتہائی محدود اور انفرادی زندگی یا رسمی عبادات (Prayers and rituals) سے متعلق دنیائے عیسائیت کا سا تصور رکھتے ہیں جس میں عقائد غیر متحقق' ناقابل فہم اور توہمانہ ہوتے ہیں۔ اور کتنا صحیح ہے کہ فرانسس(۲) بیکن نے کہ:

> ''توہم پرستی دہریت سے بدتر ہے۔ خدا کی نسبت بے اعتقادی ایسے اعتقاد کی نسبت بہتر ہے جو خدا کو ذلیل کرے اور اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ پہلی حالت تو محض بے اعتقادی ہے اور دوسری خدا کی تذلیل و تحقیر۔ توہم پرستی بے اعتقادی کی نسبت زودتر بداخلاقیاں پیدا کرتی ہے۔ توہم پرستی مملکت کے لیے بھی خطرناک ہے' کیونکہ اس سے ایسی قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مملکت کی قوت سے بڑھ کر ہوں۔ اس حالت میں عقل مند مجبور ہوتے ہیں کہ احمقوں کی پیروی کریں۔''

سیکولرازم کے محولہ بالا تین مرکزی نکات کا اسلام سے تصادم و تخالف ملاحظہ فرمائیے:

ازروئے قرآن زندگی کے حوادث اور کائنات کے مظاہر انسان کو کسی حقیقتِ ازلی کی خبر دیتے ہیں۔ یہ آیات یا نشانیاں ہیں ان حقائق کی جو نظر سے اوجھل ہیں' لیکن بصیرت پر منکشف ہو سکتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی کی طرح قرآن نے مظاہر فطرت کو بھی آیات کہا ہے' کیونکہ یہ تمام نشانیاں ہیں جو ایک حکیم و رحیم خالق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان میں وہ نظر پیدا ہو جائے جو منظورِ حقیقی کو براہِ راست دیکھ سکے۔ اہل ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں: ﴿يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آل عمران: ۱۹۱)۔ اس اعتبار سے ایک سائنس دان وہی کام کرتا ہے جو ایک فطرتِ سلیم رکھنے والا شخص کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ سائنس دان کا عمل صرف تحقیق و علم اور عملی ایجادات کے لیے ہوتا ہے اور مؤمن کا عمل عبرت' عرفانِ حقیقت اور اثباتِ توحید کے لیے۔ گویا سیکولرازم کے نقطۂ نظر کے برخلاف قرآن میں کائنات اور کائناتی واقعات کو ایمانی دعوت کے حق میں بطورِ استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ایک

---

(۱) مضمون: نوید فکر' ایک اہم سیاسی اصطلاح کا گمراہ کن مفہوم' قسط نمبر ۱۱' روزنامہ ''جنگ'' لاہور۔

(۲) فرانسس بیکن پیدائش ۱۵۶۱ء وفات ۱۶۲۶ء بحوالہ تاریخ فلسفہ جدید' جلد اول' ص ۲۳۵۔

سلیم الفطرت اور صاحبِ بصیرت انسان کو ساری کائنات صفاتِ خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔ اسلام نے شرک اور اوہام کو ختم کر کے توحید کو غالب کیا اور اس طرح اس ذہن کو فروغ دیا جس نے عالمِ فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ مسلمانوں کی سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں عقیدۂ توحید کی اہمیت کو بریفالٹ اور آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵۔۱۸۸۹ء) نے بھی واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

اب آیئے دوسرے اور تیسرے نکتے کی جانب۔ اسلام کے لیے اصلاً قرآنی اصطلاح ''دین'' مستعمل ہے جس کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے اور نہایت گہرا اور وسیع الذیل بھی۔ تصورِ خدا اور دیگر ایمانیات سے لے کر انسانی زندگی' انفرادیت اور اجتماعیت کے تمام پہلو اس کے اجزاء ہیں۔ اَخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرت اور سیاست کے اصول بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام دنیائے عیسائیت کے تصورِ مذہب کے مطابق چند فرسودہ عقائد (dogmas) اور بے روح رسمی عبادتوں (rituals) کا مجموعہ نہیں' بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب خود بہت سے مغربی مفکرین اور مستشرقین 'دین' کے لیے 'A Complete code or way of life' کی مفصل تشریحی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا فکر اس مسئلے پر بالکل واضح اور راسخ العقیدہ جمہور مسلمانوں کے فہم اسلام کی پُرزور پیرائے میں تائید کرتا ہے۔ چنانچہ آپ کی اہم تصنیف 'اسلامک آئیڈیالوجی' کے ابتدائیے میں درج ذیل سطور لائق توجہ ہیں:

1. Islam was not satisfied with preaching only broad principles, it was considered essential to create a system and a discipline which should embody those principles in individual and social life. It is a complete code of life based on a definite out look on life.

2. The Muslims believe that the essentials of Islam are eternal and so is the system called Shariat. The belief of the auther is that the essential framework of the Shariat too, which can be studied from the teachings of the Quran and the authentic sayings and practices of the Prophet, rests on eternal verities. It is a creed that can never become outworn.

اسی طرح علامہ اقبالؒ پر اپنی ضخیم اور انتہائی وقیع کتاب 'فکر اقبال' کے صفحہ ۶۸۲ پر رقمطراز ہیں:

''اسلام دین اور دنیوی زندگی کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں۔ اس کی وحدت زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ دنیا کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے برتنا ہی دین ہے۔''

خلیفہ صاحب کے انتقال کے بعد مرحوم جسٹس ایس اے رحمان کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب The Prophet and His Message کے باب بعنوان ''اسلام اور ڈیموکریسی'' میں ایک آئیڈیل اسلامی ریاست اور ہیئتِ اجتماعیہ کے اہم خدوخال فاضل مصنف نے چودہ نکات میں پیش کیے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل تین موضوع زیر بحث کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں اور جو اس موضوع پر خلیفہ صاحب کی اصابتِ رائے پر دال ہیں:

1. Sovereignty belongs to God alone whose chief attributes are wisdom,

justice and love. He desires human beings to assimilate there attributes in their thoughts, words and deeds.

2. An Islamic state is not theocratic but ideological. The rights and duties of its citizens shall be determined by the extent to which they identify themselves with this ideology.

3. There shall be no special class of priests in an Islamic society though persons leading better religious life and possessing better knowledge of reglious affairs have a ligitimate claim to honour. They shall enjoy no special privileges legal or economic.

اختتامی پیراگراف میں لکھتے ہیں:

These are the fundamentals of an Islamic constitution that are unalterable. No ruler or no majority possesses any right to tamper with them or alter them. This is eternal Islam rooted in the God-Centred humanity.

ہمارے ہاں کے بعض دانشور جو بزعم خویش روشن خیال' بالغ نظر' بیدار مغز اور ترقی پسند بننا یا کہلوانا چاہتے ہیں' قرآن اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات میں جمود اور ناگوار قطعیت کے شاکی نظر آتے ہیں۔ لیکن سطور بالا میں خلیفہ عبدالحکیم اسلام کے اساسی احکام کو غیر متبدل (unalterable) قرار دے رہے ہیں اور جمہور کو بھی ان میں کسی تبدیلی کا مجاز قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ قانون' ریاست اور حکومت کے معاملات میں دین کے عمل دخل کا لازمی نتیجہ تاریخی طور پر دنیائے عیسائیت کی تھیوکریسی ہے' حالانکہ یہ بات علمی طور پر قطعاً غلط اور لغو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے اوپر دیے گئے انگریزی اقتباسات سے بھی اس کی تائید وتصویب ہوتی ہے۔ اردو میں ان کی مزید تشریح خود ان ہی کے الفاظ میں سنیے' تاکہ کسی کو میری ترجمانی پر اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ 'فکر اقبال' کے صفحہ ۶۸۲ پر رقم طراز ہیں:

''اسلام کے نزدیک مملکت وحدت آفرینی کی کوشش اور روحانیت کو عملی جامہ پہنانے کا ایک وسیلہ ہے' اسلام فقط انہی معنوں میں تھیوکریسی یا دینی مملکت ہے۔ اسلام کو تھیوکریسی کے عیسوی اور مغربی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے ہاں پاپائے معصوم و آمر اور کلیسا اور پروہتوں کا نظام نہیں جو مغربی انداز کی تھیوکریسی پیدا کرتا ہے۔''

The Prophet and his Message کے باب بعنوان Law and Islam کا درج ذیل اقتباس اسلام اور سیکولرازم کے موضوع پر خلیفہ صاحب کا واضح ترین علمی موقف ہے جس کا مطلب بالکل صاف اور ہر ابہام اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

Islam without being a theocracy in the sense in which the West uses this word insisted on the common foundation of religion, morality and law. In Islamic society, law cannot be secular in the sense that it should renounce any connection with religion. For a Muslim religion

is an all-comprehensive reality.

Personal morality, social relationship, private law, public law, inter-faith or international relations must be justified or referred back to the fundamentals of Islam.

سیکولرازم کے حامی انسانی زندگی اور معاشرت کے مسائل عقل، سائنس اور سائنسی منہاج کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر وارث میر صاحب محولہ بالا مضمون میں لکھتے ہیں:

''(سیکولرازم) سے مراد ایک ایسا سیاسی یا معاشرتی نظام لیا جاتا رہا ہے جس کی اساس مذہبی امتیازات اور عقائد کی بجائے سائنس اور عقل پر ہو (اور اسلام سائنس کے خلاف نہیں ہے)۔''

لاریب، اسلام سائنس اور عقل کے خلاف ہرگز نہیں ہے، لیکن کیا اسلام اس کی اجازت دے گا کہ اس کے پیش کردہ واضح دینی تصورات اور صریح احکامات میں بھی آپ اپنی عقل اور سائنس کا استعمال شروع کر دیں۔ اس صورت میں مذہب اور ''سائنٹزم'' (Scientism) میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اور کاش کہ پروفیسر صاحب سائنس اور سائنٹیفک منہاج کے بارے میں جدید مفکّرین بالخصوص سوشل نقاد لوئیس ممفرڈ اور فرانسیسی ماہرین سائنس واجتماعیات رینے ڈویو اور یاک ایلل کے خیالات پڑھ لیں تو ان پر تازہ ترین صورتِ حال کا انکشاف ہو۔ یہ بات گزشتہ صدی کی ہے جب سائنس اور سائنٹیفک منہاج کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ یہ طریقِ تحقیق ان کے ہر عقدے اور ہر مسئلے کے حل میں مدد ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی لامحدود ہے اور اس کے ذریعے انسان ایک آئیڈیل معاشرہ اور پُرسکون زندگی حاصل کر سکتا ہے، لیکن موجودہ صدی کے وسط میں دنیا کے عظیم دانشوروں اور اہل سائنس نے اقرار کر لیا ہے کہ یہ سب خوش فہمی تھی۔ سائنس، ٹیکنالوجی، پروگریس، اقتصادی ترقی، ڈویلپمنٹ اور جدیدیت پر مشتمل جو لائحہ عمل مغربی فلاسفہ اور اہلِ دانش نے اپنے لیے تجویز کیا تھا، اب بہت سے اہلِ عقل وبصیرت کو دعوتِ فکر دے رہا ہے اور ان کی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اب متعدد مفکّرین اس امر کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ طبیعی علوم اور سائنٹیفک منہاج کو دوبارہ مابعد الطبیعیات سے مربوط کیا جائے۔ پچھلی صدی کے سائنسی علمیاتی نظریات میں اقدار، مذہبی جذبات اور مابعد الطبیعیاتی افکار کو بالکل فرسودہ اور غیر متعلق تصور کیا گیا تھا۔ لیکن منہاجیات کے موضوع پر گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران جو اہم مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں گزشتہ صدی سے رائج وحدانی اور لاقدری (value-free or positivistic) قسم کا منہاج شدید تنقید کا نشانہ بنا ہے۔ ان جدید مفکرین کا خیال ہے کہ علم کے منہاج کو وسیع النظری کے ساتھ کسی سوسائٹی کے تہذیبی اور دینی خیالات کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔ ان مفکرین میں پال فیئر آنبڈ، اوپن ہائمر، شوڈنگر اور فرتھ جوف کاپرا کے نام سرِفہرست ہیں۔ اب یہ بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ مغربی سائنس، اس کی مادّہ پرستانہ تہذیب اور اس کے ملحدانہ علمی منہاج نے انسانیت کے قافلے کو ذہنی امن وسکون اور صحت مند ترقی کی بجائے الٹا نقصان پہنچایا ہے اور تباہی کی طرف دھکیلا ہے۔ یورپ کے بعد اب امریکہ کے بعض دانشور بھی 'جدیدیت' اور 'سائنٹیفک ترقی' جیسے تصورات کی محدودیت اور نقائص کے

قائل ہوتے جارہے ہیں۔

اور عقلِ انسانی کا معاملہ جس پر سیکولرائزیشن کے حامی تکیہ کرتے ہیں' کیا مختلف ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ ؎

''عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!''

کیا فرائڈ نے اس حقیقت کو مبرہن نہیں کر دیا کہ عقل طبیعی یا عقل جزئی حیوانی سطح اسفل اکثر پر ہے' جذبات' مرغوباتِ نفس اور تعصّبات کی غلامی کرتی ہے۔ یہ مادیات اور طبیعیات میں محصور خرد انسان کو تشکیک اور تذبذب کی بھول بھلیوں سے نہیں نکال سکتی۔ انسانی عقل کو جو اپنے محدود مشاہدات اور تجربات سے اصولِ حیات اور نظریہ حقیقت کا استقرار کرنا چاہتی ہے' نہ آدم کی روح ملکوتی اور اس کے لامحدود امکانات کا ارتقاء سمجھ میں آ سکتا ہے اور نہ نبی کی نبوت۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور تزکیہ نفس ہی سے عقل میں وہ روحانی تنویر پیدا ہوتی ہے جو اسے شہوات کی غلامی اور حیلہ گری سے نجات دلاتی ہے۔ مغرب کی تعلّی آمیز اور مائل بہ الحاد عقلیت ہی سے بیزار ہو کر شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے انسانی عقلِ محدود کو الحاد آفریں' بہانہ جو اور فسوں گر کہا ہے۔ اور اس کی کوتاہ نظری اور حقیقت نارسی کا بیان مختلف پیراؤں میں کیا خوب کیا ہے:

؎ خِرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

؎ علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

؎ ہے ذوق تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

اور ؎ تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زنّاری!

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جو خود علّامہ اقبالؒ کی طرح قدیم اور جدید تفلسف میں تربیت یافتہ تھے اور 'عذابِ دانش حاضر' سے پوری طرح باخبر اور سوختۂ نارِ افرنگ تھے' اپنی تصانیف میں بتکرار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یورپ اور مغربی سائنس کے پاس محدود عقل وخرد کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔ اور خرد کے نظریات ہر دم متغیّر اور باہم متصادم رہتے ہیں' چنانچہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ خود انہیں علمی وفکری اماں ملی تو عارفِ رومیؒ کے 'اختلاطِ ذکر وفکر' میں۔

پروفیسر وارث میر صاحب نے سیکولرازم کا فلسفہ اور استدلال پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر حسین نصر کے افکار پر بھی گرفت کی ہے۔ اس بحث کو کسی دوسری نشست کے لیے مؤخر کرتے ہوئے آخر میں ان کے ایک خیال کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے دنیوی ترقی کی خواہش کو مغربیت کا متبادل تصور کر لیا۔ لفظ دنیا سے نفرت ہی لفظ سیکولرازم سے نفرت کی بنیاد بنا۔''

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ صرف الفاظ کا نہیں ان کے مفاہیم اور پس پردہ نظریات کا ہے۔ سطور بالا میں' میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیکولرازم کسی طور بھی اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اسلام دنیوی اور سائنسی ترقی کے نہ کبھی ماضی میں آڑے آیا ہے اور نہ آج ہے۔ دنیوی ترقی کا کوئی پہلو اُس وقت غیر مطلوب ہے جب وہ مسلمان کو اپنی حقیقت اور باطنی شخصیت کی طرف سے غافل کر دے اور اپنے خالق حقیقی سے بھی محجوب کر دے۔

جہاں تک حریت فکر اور ارتقاءِ حیات وتمدن انسانی کے پیش نظر ''خرد افروزی'' فکر نو اور اجتہاد کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن وسنت نے اس باب میں ہماری سوچ اور ذہن کے عمل دخل اور کارفرمائی کے لیے بڑی کھلی گنجائش فراہم کی ہے۔ ایک طرف دین کے صریح اوامر ہیں جن میں فرض' واجب' سنت مؤکدہ اور سنت غیر مؤکدہ کی تخصیص اور درجہ بندی ہے اور دوسری طرف صریح اور منصوص تحریمات ہیں جن میں مکروہاتِ تحریمی اور مکروہاتِ تنزیہی شامل ہیں جو اگرچہ حرام مطلق نہیں۔ ان دو فصیلوں کے درمیان مباحات کا ایک وسیع دائرہ ہے جہاں مسلمان جمہور اپنے لیجسلیٹو یعنی قانون ساز اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ اجتہادی فکر نو پروفیسر وارث میر صاحب کی رائے کے برعکس ''سیکولر'' نہیں ہوتا' کیونکہ صدقِ دل سے کلمۂ توحید اور اثباتِ رسالت کے بعد ایک مؤمن صادق کی شرح اور نظر قولِ رسول ﷺ کے مطابق ایمانی اور نورانی ہو جاتی ہے: ((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))۔

جو لوگ اسلام کی اساسات' اس کے تہذیبی ڈھانچے اور متفقہ ومسلمہ قانونی پہلو میں ترقی پسندانہ روشن اور بگ ٹٹ جدیدیت کے علمبردار ہیں' ان کے علم میں یہ بات رہنی چاہیے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیائے اسلام میں اسی قسم کا فکری انقلاب لانا چاہتے ہیں جو موجودہ صدی میں بعض ''روایت شکن'' دانشوروں اور ادیبوں کی تحریروں سے مغرب میں آیا' جن میں روڈلف بلٹمان' بون ہوئے فر' پال ٹلک' بشپ آف دوہلچ جان رابنسن' ایسٹائر کی اور دوسرے بہت سے مفکرین اور ادیب شامل ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان جدید افکار کے زیر اثر عیسائیت میں سے ایک مابعد الطبیعیاتی مذہبی روایت کی حیثیت سے بچی کھچی روح بھی نکل گئی اور وہ ایک کلچرل 'کلٹ' کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ مسیحی دنیا میں اب 'ڈیتھ آف گاڈ تھیالوجی' اور خدا کے وجود پر ایمان ویقین کے بغیر کرسچین یقین (faith) کے موضوع پر کتابیں اور مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ اور عملی اعتبارات سے ہر قسم کی اخلاقی وجنسی بے راہ روی کے لیے سند جواز فراہم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مسلمان دانشوروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ عیسائیت کے برخلاف قرآن اور اسلام کی تعلیمات بالکل واضح' فطری اور عقل سلیم کے عین مطابق ہیں۔ ان میں متھس (Myths) کا شائبہ تک نہیں جن کی متھ شکنی (Demytholigizing) کے لیے کسی روڈلف بلٹمان کی ضرورت پڑے۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

۱۹۷۷ء کے رمضان المبارک کے پہلے پندرہ دنوں میں ریڈیو پاکستان لاہور سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی پندرہ تقاریر نشر ہوئی تھیں‘ جن میں سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک کے چیدہ چیدہ مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔ قرآن حکیم کے نصف اوّل کے اہم مضامین پر مشتمل یہ تقاریر محترم ڈاکٹر صاحب نے خود قلم بند فرمائی تھیں‘ اور یہ ’’قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ‘‘ کے نام سے سالہا سال سے شائع ہو رہی ہیں۔ اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے کہ قرآن حکیم کے نصف آخر کے اہم مضامین بھی اسی طرح ضبطِ تحریر میں لا کر کتابی شکل میں پیش کیے جائیں۔ اس حوالے سے محترم ڈاکٹر صاحب کے ۱۹۹۹ء کے رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کے دوران بیان کیے گئے ’’خلاصۂ مضامین قرآن‘‘ کو ترتیب وتسوید کے بعد سہ ماہی حکمت قرآن میں جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ سے قسط وار شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا جو مسلسل ۱۸ قسطوں میں مکمل ہو گیا ہے اور زیر نظر صفحات میں بحمد اللہ اس سلسلہ کی آخری قسط پیش کی جا رہی ہے —— ان شاء اللہ العزیز‘ قرآن مجید کے نصف اول (سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکھف) کے مضامین کی طرح نصف دوم (سورۂ مریم تا سورۃ الناس) کے مضامین کو بھی بہت جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا تا کہ ’’قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ‘‘ مکمل صورت میں قارئین کے استفادہ کے لیے دستیاب ہو سکے۔ (ادارہ)

سُورَۃُ الْبَیِّنَۃ

سورۃ البیّنہ کا ابتدائی مضمون بہت اہم ہے۔ مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف شہروں میں آباد تھے‘ حضور اکرم ﷺ کے اوّلین مخاطب تھے۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے:

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَہْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَہُمُ الْبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیْہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾

''کافر اہل کتاب اور مشرکین (گمراہی کے جس راستے پر چل رہے تھے اس سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس بینہ (روشن دلیل) نہ آ جاتی۔ (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے' جن میں بالکل درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔''

اس لحاظ سے نبی اکرم ﷺ اور قرآن حکیم مل کر ''بیّنہ'' بن جاتے ہیں۔

اس سورۃ کی آیت ۵ اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے بایں طور کہ اس میں دین کا لُبّ لُباب بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

''ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہی کہ اللہ کی بندگی کریں اُسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اور یہی دینِ قیّم (صحیح' درست اور مضبوط دین) ہے۔''

اس آیت میں ''بندگی'' کے مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ بندگی یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی مکمل یکسوئی کے ساتھ اللہ کی ایسی اطاعت کرے جس میں شرک کا شائبہ تک نہ ہو اور پھر اس اطاعت کے اظہار کے لیے اسلام کے جملہ ارکان پر بھی عمل پیرا ہوا جائے —— اس آیت میں اسلام کے بنیادی ارکان میں سے دو اہم ارکان نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس سورۃ کی آخری آیت میں اہلِ جنّت کا ذکر بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے اور آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ﴾ ''یعنی ''اہلِ ایمان جنّت میں اس حال میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے کہ وہ اپنے پروردگار سے راضی اور پروردگار ان سے راضی۔ (سبحان اللہ!) —— اسی سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الفجر کے آخر میں بھی آئے ہیں' جہاں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸﴾ ''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل (اس حال میں کہ) تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔''

سُوْرَۃُ الزِّلْزَال

سورۃ الزلزال سے سورۃ التَّکاثُر تک چار سورتوں کا ایک گروپ ہے جس میں قیامت کا تذکرہ بہت زوردار اور جھنجھوڑنے والے انداز میں کیا گیا ہے —— یہاں یہ بھی واضح رہے کہ قرآن حکیم کی آخری ۱۶ سورتوں میں سے ہر ایک سورت کا مضمون ایسی مربوط شکل میں پیش کیا گیا ہے کہ کسی ایک آیت کو الگ کر کے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہاں ان سورتوں کا مکمل ترجمہ بیان کیا جا رہا ہے تاکہ بات پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

سورۃ الزّلزال میں زمین کی تباہی کو موضوع بنایا گیا اور بیان کیا گیا کہ روزِ قیامت زمین اپنی تمام خبروں کو بیان کر دے گی اور انسان اپنے تمام اعمال بچشمِ سر خود دیکھ لے گا۔ ارشاد ہوا:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ؕ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾

’’جب یہ زمین بڑی شدت سے جھنجھوڑ دی جائے گی‘ اور زمین اپنے سارے بوجھ باہر نکال دے گی (یعنی وہ تمام انسان جو اُس کے پیٹ میں ہوں گے‘ انہیں باہر اُگل دے گی) اور انسان حیران و ششدر ہو کر کہے گا: اسے کیا ہوا؟ اس روز یہ زمین خود اپنی خبریں بتائے گی (کہ میری پیٹھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں نے کیا کیا کرتوت کیے ہیں) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔ اُس دن لوگ الگ الگ گروہ بن کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ تو جس کسی نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا‘ اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔‘‘ ☆

سُورَۃُ العٰدِیٰت

یہ اس گروپ کی دوسری سورۃ ہے۔ اس کا آغاز چند قسموں سے ہو رہا ہے —— میں عرض کر چکا ہوں کہ اس انداز کی پانچ سورتیں ہیں: **الصّافّات‘ الذّاریات‘ المُرسلات‘ النّازعات** اور **العادیات**۔ ان سب کا آغاز مختلف قسموں سے ہو رہا ہے اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ پانچوں سورتیں مماثل ہیں۔

سورۃ العادیات میں گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے —— گھوڑوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور مالک کے حکم کی تعمیل میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ گھوڑوں کے پاؤں اگرچہ زخمی بھی ہوں تب بھی وہ اپنے مالک کے حکم پر اس قدر تیزی سے دوڑ رہے ہوتے ہیں کہ دشمنوں کی صفوں کو چیرتے چلے جاتے ہیں اور پیٹھ نہیں پھیرتے —— اس سورۃ میں گھوڑوں کی قسم کھا کر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یہ حیوانات کتنے سمجھ دار اور اپنے مالک کے وفادار ہیں‘ لیکن انسانوں میں تو حیوانوں جیسی وفا بھی نہیں ہے‘ بایں طور کہ انسان تو اللہ کے احکام سے سرتابی کرتا ہے جو اس کا خالق‘ مالک اور رازق ہے۔ اس ضمن میں فرمایا:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾

☆ سورۃ الزلزال کی آخری دو آیات کے حوالے سے ابن ابی حاتم نے ایک روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیات ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧ ﴾ نازل ہوئیں تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ہاں‘‘۔ میں نے عرض کیا: یہ بڑے بڑے گناہ بھی؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں‘‘۔ میں نے عرض کیا اور یہ چھوٹے موٹے گناہ؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں‘ یہ بھی‘‘۔ اس پر میں نے کہا: پھر تو میں مارا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’خوش ہو جاؤ اے ابوسعید! ہر نیکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔‘‘ (اضافہ از مرتب‘ بحوالہ تفہیم القرآن)

’’ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم—— جو ہانپ اٹھتے ہیں ☆۔ پھر پتھروں پر (نعل) مار کر آگ نکالتے ہیں۔ پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ گرد اٹھاتے ہیں۔ پھر اس وقت (دشمن کی) فوج میں جا گھستے ہیں —— کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان ناشناس ہے۔ اور وہ یقیناً اس بات پر خود گواہ ہے۔ اور وہ یقیناً مال سے شدید محبت کرنے والا ہے۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب کہ جو (مردے) قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے۔ اور جو (بھید) دلوں میں ہیں وہ ظاہر کر دیے جائیں گے۔ بے شک ان کا پروردگار اس روز ان سے خوب واقف ہوگا۔‘‘

سُورۃُ الْقَارِعَۃ

سورۃ القارعہ کا انداز بعینہٖ سورۃ الحاقّہ والا ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا: ﴿اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳﴾ جبکہ یہاں فرمایا گیا: ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳﴾ یعنی اس سورہ میں قیامت کو کھڑکھڑانے والی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سورۃ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس مختصر سی سورت میں قیامت کے پہلے مرحلے یعنی اس کے قائم ہونے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالمِ آخرت کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا:

اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

’’کھڑکھڑانے والی! کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟ اور تمہیں کیا پتا کہ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی؟ (وہ قیامت ہے) جس دن انسان بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے‘ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگ برنگی روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ تو جس (کی نیکی) کا پلڑا بھاری ہوگا وہ (ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں) دل پسند عیش میں رہے گا‘ اور جس (کی نیکی) کا پلڑا ہلکا ہوگا‘ اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے۔ اور تم کیا سمجھو کہ ہاویہ کیا چیز ہے؟ وہ آگ ہے دہکتی ہوئی!‘‘

سُورۃُ التَّکَاثُر

سورۃ الزلزال سے شروع ہونے والے چار سورتوں کے گروپ کی یہ آخری سورۃ ہے۔ اس سورۃ میں لوگوں کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے‘ ان پر فخر کرنے اور دنیا پرستی میں غرق ہو جانے کے بُرے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸

☆ ضَبْح کہتے ہیں اس خاص آواز کو جو دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی شدتِ تنفّس (یعنی زور سے سانس لینے کی وجہ) سے نکلتی ہے۔ یہ آواز گھوڑوں کے سوا کسی اور کے جانور کے منہ سے نہیں نکلتی۔ (مرتب)

”(لوگو! مال کی) بہتات کی طلب تمہیں غافل کیے رہتی ہے‘ یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچتے ہو۔ ہرگز نہیں‘ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں‘ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں‘ اگر تم یقینی علم کے ساتھ جانتے (تو غفلت میں نہ پڑتے)۔ تم ضرور جہنم کو دیکھو گے۔ پھر اس کو ضرور دیکھو گے یقین کی آنکھ سے۔ پھر ضرور اس روز تم سے (تمہیں دی ہوئی) نعمتوں کا حساب مانگا جائے گا۔“

سُورۃُ العَصر

سورۃ العصر کی اہمیت کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول ہے: لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ”اگر لوگ صرف اس سورت پر ہی تدبر کر لیں تو یہ (ان کی ہدایت و رہنمائی) کے لیے کافی ہو جائے گی“۔ امام شافعی کا دوسرا قول ہے: لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ ”اگر قرآن مجید میں سوائے اس سورۃ کے اور کچھ نہ بھی اُترتا تو یہ سورۃ ہی لوگوں کے لیے کفایت کر جاتی“ —— اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس مختصر سی سورۃ میں پورے قرآن مجید کا خلاصہ موجود ہے۔

سورۃ العصر اگرچہ قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے مگر اس میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جا سکتا ہے —— ”مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب“ جو میں نے ترتیب دیا ہے اس کا نقطہ آغاز ”لوازمِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں“ کے عنوان سے اس سورۃ کو بنایا ہے—— اس سورۃ مبارکہ میں خسارے سے بچنے کی چار لازمی شرائط بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوا:

وَالْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

”زمانہ کی قسم‘ یقیناً تمام انسان گھاٹے اور خسارہ میں ہیں‘ سوائے ان کے جو: (۱) ایمان لائے‘ (۲) نیک عمل کیے‘ (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی‘ اور (۴) باہم ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کی۔“

اس سورہ میں بالکل دوٹوک انداز میں بیان کر دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور تباہی و بربادی کا راستہ کون سا ہے۔

سُورۃُ الھُمَزَۃ

سورۃ الہمزہ میں انسان کی سیرت و کردار کی پستی بیان ہوئی ہے۔ جیسے مکھی گندگی پر ہی بیٹھتی ہے ایسے ہی کچھ لوگ بڑے تنگ ظرف ہوتے ہیں اور ان کا کام صرف چغلیاں کھانا اور لوگوں کو طعنے دینا ہوتا ہے۔ ایسے انسان لوگوں کے دل دکھا کر بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ مال جمع کرتے ہیں‘ اس کو گنتے رہتے ہیں اور اس میں اضافہ سے ان کو خوشی اور سکون ملتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کی خبر زیر مطالعہ سورت میں بڑی خوبصورتی سے دی جا رہی ہے۔ فرمایا:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾

’’تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو دوام عطا کر دے گا۔ ہرگز نہیں‘ بلکہ وہ ’حطمہ‘ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور جانتے ہو کہ وہ ’حطمہ‘ کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے‘ جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حال میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے‘ جیسے تندور کو اگر ڈھانپ دیا جائے تو اس کی آگ اندر ہی اندر جوش کھاتی رہتی ہے)۔‘‘

سُورۃُ الفِیْل

سورۃ الفیل اور سورۃ القریش ایک جوڑا ہے اور ان کا آپس میں خاص تعلق ہے۔ سورۃ الفیل میں ایک تاریخی واقعہ ’’واقعہ اصحاب الفیل‘‘ ☆ کا ذکر ہے۔ خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے ابرہہ کی جو فوج آئی تھی اور پھر اس کا جو حشر ہوا‘ اسے جامع الفاظ میں اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۙ﴿۳﴾ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ﴿۵﴾

’’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اس نے ان کی چال کو ناکام نہیں بنا کر رکھ دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیج دیے‘ جو ان پر پکی ہوئی مٹی کی کنکریاں مار رہے تھے۔ پھر ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند بنا کر رکھ دیا۔‘‘

اس سورۃ کی آیت ۴ میں ’’سِجِّیل‘‘ کا لفظ ہے جو فارسی کے لفظ ’’سنگِ گِل‘‘ سے بنا ہے اور اس سے مراد وہ مٹی ہے جو پک کر پختہ ہو جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ سخت قسم کے سنگ ریزوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

سُورۃُ القُرَیْش

سورۃ القریش میں قریش پر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے خاص احسان کو بیان کیا گیا ہے جو صرف بیت اللہ کی بدولت ان پر ہوا۔ وہ احسان یہ تھا کہ یہ لوگ بلاخوف وخطر بغرضِ تجارت گرمیوں میں شام وفلسطین کی طرف اور سردیوں میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے۔ یہ لوگ بیت اللہ کے متولی تھے اور بیت اللہ کی عظمت کی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے قافلوں کو چھیڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسرا احسان یہ تھا کہ اس علاقے کو تجارتی قافلوں کی شاہراہ کا درجہ مل گیا تھا جو جزیرہ نمائے عرب سے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی تھی‘ اس طرح یہ لوگ باقی عرب سے خوشحال تھے۔ اس سورۃ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس احسان کو یاد کرا رہا ہے کہ اس عظمت والے گھر کی بدولت میں نے تم پر اتنے احسان کیے مگر تم نے احسان فراموشی کرتے ہوئے توحید کے اس

☆ یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور تفہیم القرآن میں اس کی تفصیل اور اس کے پس منظر کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی ایک خاص بات تو ابرہہ اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب کا مکالمہ ہے‘ جبکہ دوسری خاص بات جناب عبدالمطلب کی وہ خاص دعا ہے جو انہوں نے اس موقع پر کعبہ کے دروازہ کے کنڈے کو پکڑ کر اشعار کی صورت میں مانگی تھی۔ یہ دونوں باتیں نہ صرف پڑھنے‘ بلکہ یقینی طور پر سنہری حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔

عظیم مرکز کو شرک کا اڈا بنا دیا۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اسے شرک سے پاک کر کے دوبارہ توحید کا مرکز بنا دو اور صرف اس گھر کے رب کی عبادت کرو۔ فرمایا:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ﴿۲﴾ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۬ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

''قریش کے مانوس کرنے کے سبب' (یعنی) ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی بندگی کریں' جس نے ان کو بھوک سے سیری عطا فرمائی (اس کے باوجود کہ جس وادی کے یہ رہنے والے ہیں اس میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی) اور ان کو خوف سے امن دیا (کہ بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے کوئی ان کے تجارتی قافلوں کو نہیں چھیڑتا)۔''

سُورۃُ المَاعُون

اس سورہ کا مضمون سورۃ المطفّفین کے ابتدائی مضمون کے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں ان کے عمل کی وجہ سے ان کے ایمان کی نفی کی گئی تھی کہ جو لوگ کم تولتے ہیں انہیں آخرت کا یقین نہیں ہے' جبکہ یہاں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے بلکہ اسے جھٹلاتے ہیں تو ان کا کردار مختلف اعتبارات سے پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرمایا:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ؕ﴿۳﴾

''بھلا تم نے ایسے شخص کو دیکھا جو جزا و سزا کا منکر ہے؟ یہ وہی (بد بخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے' اور مسکین کو کھانا کھلانے کی طرف لوگوں کو راغب نہیں کرتا۔''

یعنی نہ تو خود ہی یہ کام کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے۔

سورۃ کے درمیان میں نماز کے حوالے سے خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی۔ فرمایا: ﴿فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ﴿۴﴾ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ﴿۶﴾﴾ ''پس ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے' جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں' اور ریاکاری کرتے ہیں ——— اس غفلت کے کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز پڑھ ہی نہیں رہے۔ دوسرے یہ کہ پڑھ تو رہے ہیں مگر اس کی روح موجود نہیں ہے' بس رسماً اُٹھک بیٹھک ہو رہی ہے' مگر اس میں خشوع و خضوع نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ بھی غفلت کا ایک درجہ ہے' جبکہ غفلت کا ایک درجہ ریاکاری ہے جس کا ذکر آیت ۶ میں تخصیص کے ساتھ کر دیا گیا ہے' اس لیے کہ ریاکاری سے کی گئی کوئی بھی عبادت اور نیکی قابل قبول نہیں۔

آخری آیت میں پھر سے قیامت کے منکرین کی پستی کو بیان کیا جا رہا ہے کہ ان کے کردار کی پستی اور کم ظرفی کا عالم یہ ہے کہ: ﴿وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾﴾ ''اور (ایسے لوگ) عام برتنے کی چیز بھی کسی کو وقتی استعمال کے لیے دینے کو بھی تیار نہیں۔''

سُورۃُ الکوثَر

سورۃ الکوثر میں رسول اللہ ﷺ کا ایک خاص مقام بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

''(اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کیا ہے' پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے' اور جان لیجیے کہ آپ کا دشمن ہی ہے جس کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔''

اس سورۃ کے حوالے سے دو باتیں جان لیجیے: (۱) ''کوثر'' (خیر کثیر) سے دنیا اور آخرت کی بے شمار بھلائیاں مراد ہیں۔ اس ضمن میں بہت سے اقوال ہیں جن کو مختلف مفسرین کرام نے تفصیل سے اپنی تفاسیر میں بیان کیا ہے۔ ان میں روزِ حشر کا حوضِ کوثر اور جنت کی نہر کوثر بھی شامل ہیں۔ (۲) ''ابتر'' عرب میں اس شخص کو کہا جاتا تھا جس کی نسل ختم ہو جائے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی اولادِ نرینہ نہ تھی بلکہ صرف بیٹیاں ہی تھیں' جبکہ نسل بیٹوں سے چلتی ہے' تو قریش کے کچھ سرداروں نے حضور ﷺ کو ''ابتر'' ہونے کا طعنہ دیا تھا کہ بس کچھ دن تک آپ کا نام ہوگا اور پھر آپ کا کوئی نام لیوا نہ ہوگا۔ اس طعنہ کے جواب میں حضور ﷺ کو تسلی دینے کے انداز میں کہا گیا کہ کچھ عرصہ میں آپؐ کے تمام دشمنوں کے تو نام ونشان تک مٹ جائیں گے ـــــ دراصل یہ ایک پیشین گوئی تھی جو عہد نبوی ہی میں پوری ہوئی اور بدر کے مقام پر قریش کے بڑے بڑے ستّر (۷۰) سردار مارے گئے ـــــ جبکہ آپ ﷺ کا ذکر وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے مصداق تا قیامِ قیامت قائم رہے گا' بلکہ اللہ عزوجل نے آپؐ کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ بایں طور منسلک کر لیا ہے کہ جہاں کہیں اللہ کا نام لیا جائے گا وہاں محمد ﷺ کا نام بھی آئے گا۔ سبحان اللہ!

سُورۃُ الکَافِرون

اس سورۃ میں کفار سے اعلانِ براءت کیا گیا ہے اور یہ اعلانِ براءت بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں یٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ''اے کافرو'' کہہ کر خطاب ہوا ہے اور یہ داعیانہ انداز نہیں ہے۔ اس اندازِ خطاب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس آخری دور کی بات ہے جب اتمامِ حجت ہو چکا' لیکن کافر پھر بھی اپنے کفر پر اَڑے رہے تو ان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

''(اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: اے کافرو! میں ہرگز ان (بتوں) کو پوجنے والا نہیں ہوں جن کو تم پوجتے ہو۔ اور نہ تم پوجنے والے ہو اس (اللہ) کو جس کی پرستش میں کر رہا ہوں۔ اور جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں۔ اور نہ تم اس کی پرستش کرنے والے ہو جس کی میں پرستش کرتا ہوں (اس لیے اب میرے اور تمہارے درمیان قطع تعلق ہے' لہٰذا) میرے لیے میرا دین ہے اور تمہارے لیے تمہارا دین۔''

بعض لوگ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کو نرم انداز (جس کو آج کل ''مفاہمتی انداز'' کہا جاتا ہے) سمجھتے ہیں جیسے کہا جائے کہ اچھا جی چلو تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین' یعنی ایک صلح کن انداز۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے' بلکہ یہ انقطاع کا اعلان ہے کہ اب میرا اور تمہارا تعلق ختم ہو گیا۔

سُورۃُ النَّصر

سورۃ النصر کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ مدنی سورۃ ہے' جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ مکی ہے۔ دراصل یہ سورۃ بلحاظِ نزولِ مقام مکی ہے اور بلحاظِ زمانہ مدنی ہے' یعنی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور اس کا نزول حجۃ الوداع میں ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری (مکمل) سورۃ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ ارشاد ہوا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

''جب آ پہنچی اللہ کی مدد اور فتح (حاصل ہو گئی) اور آپ نے لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیا (یعنی آپؐ کے مشن کی تکمیل ہو گئی)۔ پس آپ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس سورۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔ اکثر روایات میں آتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے تسبیح و استغفار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے: ((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ)) اس لیے کہ اس سورۃ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کے بعد رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کا اشارہ ہے۔ حدیث و سیرت کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت آپؐ کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ((اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى)) یعنی اب اللہ کی طرف لوٹنا ہے جو بزرگ و برتر رفیق ہے!

سُورۃُ اللَّهَب

یہ ابتدائی مکی دور کی سورۃ ہے اور اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خطبہ کا ذکر ہوا ہے۔ آپؐ نے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے عرب کے رواج کے مطابق جب کوہِ صفا پر چڑھ کر آواز لگائی: وا صباحا تو قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ پہاڑ کے پاس جمع ہو گئے۔ تب آپؐ نے انہیں دین اسلام اور توحید کی دعوت دی تو اُس وقت ابولہب نے (نعوذ باللہ) یہ گستاخانہ الفاظ کہے: تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا ''ہلاکت و بربادی ہو تمہارے لیے' کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے یہاں جمع کیا تھا؟'' اس کے جواب میں اس سورۃ کا نزول ہوا اور اللہ کے غضب کا اظہار ہوا۔ فرمایا:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚۖ﴿۳﴾ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

''ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور وہ برباد ہو گیا۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا اس کے کسی کام نہ آیا۔ عنقریب وہ دہکتی آگ میں ڈال دیا جائے گا' اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی۔ جو ایندھن سر پر رکھے اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہو گی۔''

قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ابولہب حضور ﷺ کا حقیقی چچا تھا اور اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ اس کی بیوی کا نام اَروٰی اور کنیت اُمّ جمیل تھی۔ اسے حضور ﷺ سے بہت بغض و عداوت تھی —— سورۃ التحریم میں میاں بیوی کے نیک اور بد ہونے کے حوالے سے قرآن کریم میں موجود چند ایک مثالیں بیان کی گئی تھیں۔ پہلی مثال بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی ہے کہ حضرات نوح و لوط علیہما السلام (جو اللہ کے رسول ہیں) کی بیویوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ جہنمی ہیں۔ دوسری مثال بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین و پاکیزہ خاتون کی ہے کہ فرعون (جو اللہ اور اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن تھا) کی بیوی حضرت آسیہ ایک جنتی خاتون ہیں۔ پھر حضرت مریم کی مثال دی گئی جو خود بھی نیک سیرت تھیں اور ان کی تربیت اللہ کے پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کی گود میں ہوئی۔ یہ مثال ہے ''نورٌ علٰی نور'' کی۔ ان تین صورتوں کے علاوہ ایک چوتھی صورت یہ بھی ہے کہ شوہر بھی بدترین اور بیوی بھی بدترین۔ اس کی مثال زیر مطالعہ سورۃ میں بیان ہوئی ہے کہ ابولہب اور اُس کی بیوی اُمّ جمیل' نبی اکرم ﷺ سے قرابت کے باوجود' دونوں آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے۔ یہ مثال ہے ''ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کی۔

سُورۃُ الاِخلَاص

سورۃ الاخلاص قرآن حکیم کی عظیم ترین سورۃ ہے جس کو حضور ﷺ نے ثلث قرآن کے مساوی قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ دین کی اصل اساسات تین ہیں: (۱) توحید' (۲) رسالت' اور (۳) آخرت۔ اور یہ سورۃ ان تین اساسات میں سے ایک یعنی توحید پر کامل ترین سورۃ ہے۔ ارشاد ہوا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤

''کہہ دو وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ (سب سے) بے نیاز ہے (اور سب اس کے محتاج ہیں)۔ نہ اُس نے کچھ جنا اور نہ ہی وہ جنا گیا (یعنی نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے)۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔''

سُورۃُ الفَلَق

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس دو الگ الگ سورتیں ہیں' لیکن ان میں مضامین کی اتنی یکسانیت ہے کہ ان کا ایک مشترک نام ''مُعَوِّذَتَین'' (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) ہے۔ یہ دونوں سورتیں بالاتفاق مدنی ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ تعوّذ کی تلقین کی گئی ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ وہ مختلف برائیوں' گناہوں اور تکالیف و مصائب پہنچانے والی چیزوں سے اپنے رب کی پناہ میں آنے کی دعا مانگتا رہے۔

سورۃ الفلق میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١﴾ ''کہہ دو میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا

ہوں‘‘۔۔۔ فَلَقَ یَفْلِقُ کے لغوی معنی پھاڑنے کے ہیں۔سورۃ الانعام میں فرمایا:﴿فَالِقُ الْاَصْبَاحِ﴾ (آیت ۹۶) ’’وہی ہے صبح کو پھاڑنے والا‘‘۔ یعنی اللہ تعالیٰ رات کے اندھیرے سے صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے۔ یہاں بھی فلق سے مراد ’’صبح‘‘ ہے۔

سورۃ الفلق کی پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کا بیان ہے جبکہ اگلی چار آیات میں ان اشیاء کا بیان ہے جن سے پناہ مانگی جارہی ہے‘ فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

’’کہو میں صبح کے مالک کی پناہ میں آتا ہوں‘ ہر چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی۔ خصوصاً شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے (یہ حقیقت ہے کہ جب رات کی تاریکی کا پردہ تن جاتا ہے تو شر کا بازار زیادہ گرم ہو جاتا ہے)‘ اور گرہوں پر پھونک مارنے والیوں (یعنی جادو ٹونے کرنے والیوں) کے شر سے‘ اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔‘‘

سُورۃُ النَّاس

سورۃ الناس میں سورۃ الفلق کے برعکس اللہ تبارک وتعالیٰ کی تین صفات بیان کر کے اس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

’’کہو کہ میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے پالنے والے‘ لوگوں کے حقیقی بادشاہ اور لوگوں کے معبودِ برحق کی‘ (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے‘ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے‘ خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔‘‘

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ وسوسہ اندازی صرف شیاطینِ جن و اِنس ہی نہیں کرتے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اندر سے وسوسہ اندازی کرتا ہے اور اس کے اپنے غلط نظریات اس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں‘ اس لیے نفس کی برائی سے بھی پناہ مانگنی چاہیے۔

بکثرت صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات کو سوتے وقت اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں مُعَوِّذَتَیْن‘ یا بعض روایات کے مطابق مُعَوِّذَات (یعنی سورۃ الاخلاص‘ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر‘ جہاں جہاں بھی ہاتھ پہنچ سکتے‘ انہیں پھیر لیتے تھے۔

بارك اللّٰه لی ولكم فی القرآن العظیمْ ونفعنی وایّاكم بالایات والذكر الحكیمoo

ترجمۂ قرآن مجید
مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ المائدۃ

آیات ۱ تا ۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ب ھ م

(x) : ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

بَهِيْمَةٌ : جس کے منہ سے نکلی ہوئی آواز مبہم ہو' بے زبان' آیت زیر مطالعہ۔

ص ی د

صَادَ يَصِيْدُ (ض) صَيْدًا : شکار کرنا۔

صَيْدٌ (اسم ذات) : شکار' آیت زیر مطالعہ۔

اِصْطَادَ (افتعال) اِصْطِيَادًا : شکار کھیلنا' آیت زیر مطالعہ۔

ق ل د

قَلَدَ يَقْلِدُ (ض) قَلْدًا : (۱) رسی بٹنا (۲) گلے میں تلوار یا کوئی چیز لٹکانا۔

قِلَادَۃٌ ج قَلَائِدُ : گلے میں پڑی ہوئی کوئی چیز' جیسے پٹہ' ہار' نیکلس وغیرہ۔ آیت زیر مطالعہ۔
مِقْلَادٌ ج مَقَالِیْدُ : پٹہ کھولنے کا آلہ' کنجی۔ ﴿لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ (الزمر:٦٣) ''اُسی کے لیے ہیں زمین اور آسمانوں کی کنجیاں۔''

ج ر م

جَرَمَ یَجْرِمُ (ض) جَرْمًا : کسی کو کسی برائی پر آمادہ کرنا' پھر مطلقاً آمادہ کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔
جَرِمَ یَجْرَمُ (س) جَرَمًا : صاف ہونا' یقینی ہونا۔
جَرَمٌ : صاف' یقینی۔ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّ لَھُمُ النَّارَ﴾ (النحل:٦٢) ''نہیں! یقینی ہے کہ ان لوگوں کے لیے آگ ہے۔'' اس میں ''لَا'' منفصلہ ہے۔ جیسے ''لَا اُقْسِمُ'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں قسم نہیں کھاتا' بلکہ ''لَا'' الگ یعنی منفصل ہے اور ''اُقْسِمُ'' الگ ہے۔ اس لیے اس کا مطلب ہے: ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں''۔ ایسے ہی ''لَا جَرَمَ'' کا ''لَا'' بھی الگ یعنی منفصل ہے۔ عام قاری کو اس باریکی میں الجھانے کے بجائے عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''کوئی شک نہیں ہے۔''
اَجْرَمَ (افعال) اِجْرَامًا: برائی کرنا' جرم کرنا۔ ﴿فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿٣٥﴾﴾ (ھود) ''تو مجھ پر ہے میرا جرم کرنا اور میں بری ہوں اس سے جو تم لوگ جرم کرتے ہو۔''
مُجْرِمٌ (اسم الفاعل) : جرم کرنے والا' مجرم۔ ﴿وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨﴾﴾ (الانفال) ''اور خواہ کراہیت کریں مجرم لوگ۔''

ش ن ء

شَنَأَ یَشْنَؤُ وَ شَنِأَ یَشْنَؤُ (ف۔س) شَنَاٰنٌ : بغض رکھنا' نفرت کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔
شَانِئٌ (اسم الفاعل) : بغض رکھنے والا۔ ﴿اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ ﴿٣﴾﴾ (الکوثر) ''بے شک آپؐ سے بغض رکھنے والا ہی انتہائی بے نام ونشان ہے۔''

ترکیب

''اُحِلَّتْ'' کا نائب فاعل ''بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ'' ہے جو کہ مرکب اضافی ہے' لیکن اردو محاورے کی ضرورت کے تحت اس کا ترجمہ مرکب توصیفی کا ہوگا' یعنی بے زبان مویشی۔ ''غَیْرَ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے' اس کا مضاف الیہ ''مُحِلِّیْنَ'' تھا جو ''اَلصَّیْدِ'' کا مضاف بنا تو اس کا نون اعرابی گر گیا۔ ''اَلْقَلَائِدَ'' سے پہلے ''ذَوَاتِ'' محذوف ہے یعنی پٹوں والے۔ ''اٰمِّیْنَ'' اسم الفاعل ہے اور ''لَا تُحِلُّوْا'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ پھر اس نے فعل کا عمل کیا ہے تو ''اَلْبَیْتَ الْحَرَامَ'' اس کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہوا ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو
اَوْفُوْا : تم پورا کرو
اُحِلَّتْ : حلال کیا گیا
بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ : بے زبان مویشیوں کو
يُتْلٰى عَلَيْكُمْ : پڑھ کر سنایا جائے گا تم کو
وَ : اس حال میں کہ
حُرُمٌ : محترم ہو (یعنی احرام میں ہو)
يَحْكُمُ : حکم دیتا ہے
يُرِيْدُ : وہ ارادہ کرتا ہے
اٰمَنُوْا : ایمان لائے
شَعَآئِرَ اللّٰهِ : اللہ کی علامتوں کو
وَلَا الْهَدْيَ : اور نہ ہی قربانی کے جانور کو
وَلَآ آٰمِّيْنَ : اور نہ ہی ارادہ کرنے والوں کو
يَبْتَغُوْنَ : جو تلاش کرتے ہیں
مِّنْ رَّبِّهِمْ : اپنے رب (کی طرف) سے
وَاِذَا : اور جب

فَاصْطَادُوْا : تو شکار کرو
شَنَاٰنُ قَوْمٍ : کسی قوم کی عداوت
صَدُّوْكُمْ : انہوں نے روکا تم کو
اَنْ : کہ
وَتَعَاوَنُوْا : اور تم لوگ آپس میں تعاون کرو
وَالتَّقْوٰى : اور تقویٰ میں
عَلَى الْاِثْمِ : گناہ میں
وَاتَّقُوا : اور تقویٰ کرو
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ

اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے
بِالْعُقُوْدِ : عہدوں کو
لَكُمْ : تمہارے لیے
اِلَّا مَا : سوائے اس کے جو
غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ : شکار کو حلال کرنے والے نہ ہوتے ہوئے
اَنْتُمْ : تم لوگ
اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ
مَا : وہ جو
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو
لَا تُحِلُّوْا : تم حلال مت کرو (بے ادبی کے لیے)
وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ : اور نہ ہی محترم مہینے کو
وَلَا الْقَلَآئِدَ : اور نہ ہی پٹے (والوں) کو
الْبَيْتَ الْحَرَامَ : اس محترم گھر کا
فَضْلًا : فضل کو
وَرِضْوَانًا : اور (اس کی) رضا کو
حَلَلْتُمْ : تم لوگ حلال ہو جاؤ (یعنی احرام کھول دو)
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ : اور تم کو ہرگز آمادہ نہ کرے
اَنْ : (کیوں) کہ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : مسجد حرام سے
تَعْتَدُوْا : تم زیادتی کرو
عَلَى الْبِرِّ : نیکی میں
وَلَا تَعَاوَنُوْا : اور تعاون مت کرو
وَالْعُدْوَانِ : اور زیادتی میں
اللّٰهَ : اللہ کا
شَدِيْدُ الْعِقَابِ : سزا دینے کا سخت ہے

نوٹ : چوپاؤں میں سے اَنْعَام یعنی مویشی ایسے جانوروں کو کہتے ہیں جن کے پیر کے سُم چِرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی کرتے ہوں۔اس لحاظ سے بھیڑ' بکری' اونٹ' ہرن' نیل گائے وغیرہ سب اَنعام ہیں۔لیکن گھوڑے' گدھے' شیر' ریچھ وغیرہ اَنعام نہیں ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ آل عمران:۱۴ میں گھوڑوں کو اَنعام میں شامل نہیں کیا گیا اور ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے۔گھوڑوں کے حلال ہونے کا علم اور اسی طرح سے پرندوں میں سے کسی کے حلال ہونے اور کسی کے حرام ہونے کا علم ہمیں احادیث سے حاصل ہوتا ہے۔

آیت ۳

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

ل ح م

لَحَمَ يَلْحَمُ (ف) لَحْمًا : گوشت کھلانا۔

لَحْمٌ ج لُحُوْمٌ (اسم ذات) : گوشت۔﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا﴾ (الحج:۳۷) ''ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان کے گوشت اور نہ ہی ان کے خون۔''

خ ن ق

خَنَقَ يَخْنُقُ (ن) خَنْقًا : گلا گھونٹنا۔

اِنْخَنَقَ (انفعال) اِنْخِنَاقًا : گلا گھٹنا۔

مُنْخَنِقٌ (اسم الفاعل) : گلا گھٹنے والا' گلا گھٹ کر مرنے والا۔آیت زیر مطالعہ

و ق ذ

وَقَذَ يَقِذُ (ض) وَقْذًا : مہلک چوٹ لگانا۔

مَوْقُوْذٌ (اسم المفعول) : مہلک چوٹ لگایا ہوا' چوٹ سے مارا ہوا۔آیت زیر مطالعہ۔

ر د ی

رَدِیَ يَرْدٰی (س) رَدًی : تباہ و برباد ہونا' ہلاک ہونا' گڑھے میں گرنا۔﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶﴾ (طٰہٰ) ''پس ہرگز نہ روکے تجھ کو اس سے یعنی قیامت پر ایمان لانے سے وہ' جو ایمان نہیں لاتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی' ورنہ تو ہلاک ہوگا۔''

اَرْدٰی (افعال) اِرْدَاءً : تباہ و برباد کرنا' ہلاک کرنا۔﴿وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۲۳) ''اور یہ تمہارا وہ گمان ہے جو تم نے گمان کیا اپنے رب کے بارے میں تو اس نے تم کو ہلاک کیا۔''

تَرَدّٰی (تفعل) تَرَدٍّی : ہلاک ہونا' گڑھے میں گرنا۔ ﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪﴾ (الیل) ''اور کام نہ آئے گا اس کے اس کا مال جب وہ ہلاکت میں گرے گا۔''

مُتَرَدِّیٌ (اسم الفاعل) : گڑھے میں گرنے والا' آیت زیر مطالعہ۔

ن ط ح

نَطَحَ يَنْطَحُ (ف) نَطْحًا : سینگ مارنا۔

نَطِيْحٌ (فَعِيْلٌ کا وزن' اسم المفعول کے معنی میں) : سینگ مارا ہوا' آیت زیر مطالعہ۔

ذ ک و

ذَکَا يَذْکُوْ (ن) ذَکًا : جانور کو ذبح کرنا۔

ذَکّٰی (تفعیل) تَذْکِيَةٌ : خوب اچھی طرح ذبح کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ز ل م

زَلَمَ يَزْلُمُ (ن) زَلْمًا : خطا کرنا۔

زَلَمٌ ج اَزْلَامٌ : بغیر پَر کا تیر۔ ایسے تیر جن سے فال نکالتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ۔

خ م ص

خَمَصَ يَخْمُصُ (ن) خَمْصًا : شدید بھوک سے پیٹ کا پچک جانا' کمر سے لگ جانا۔

مَخْمَصٌ (اسم الظرف) : شدید بھوک کے وقت۔ آیت زیر مطالعہ۔

ی ء س

يَئِسَ يَيْئَسُ (س) يَأْسًا : ناامید ہونا' مایوس ہونا۔ آیت زیر مطالعہ۔

يَئُوْسٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ) : انتہائی مایوس۔ ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا ⑧۳﴾ (بنی اسراء یل) ''اور جب کبھی اس کو لگے برائی تو وہ ہو جاتا ہے انتہائی مایوس۔''

اِسْتَيْئَسَ (استفعال) اِسْتِيْئَاسًا (ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہے) : مایوسی سمجھنا یعنی مایوس ہونا۔ ﴿فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ﴾ (یوسف:۸۰) ''پھر جب وہ لوگ ناامید ہوئے اس سے یعنی یوسفؑ سے تو وہ لوگ الگ ہوئے سرگوشی کرتے ہوئے۔''

ترکیب

''حُرِّمَتْ'' ماضی مجہول ہے۔ آگے اس کے نائب الفاعل آئے ہیں۔ ''اِلَّا مَا ذَکَّيْتُمْ'' درمیان میں جملۂ معترضہ ہے۔ اس کے بعد ''مَا ذُبِحَ'' اور ''اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا'' بھی نائب الفاعل ہے۔ ''اَلْيَوْمَ'' ظرف' ''دِيْنًا'' تمیز اور ''غَيْرَ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

ترجمہ:

حُرِّمَتْ :حرام کیا گیا
الْمَيْتَةُ :مردار کو
وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ :اور سور کے گوشت کو
اُهِلَّ :پکارا گیا
بِهٖ :جس کو
وَالْمَوْقُوْذَةُ :اور چوٹ سے مارے ہوئے کو
وَالنَّطِيْحَةُ :اور سینگ مارے ہوئے کو
اَكَلَ :کھایا
اِلَّا مَا :سوائے اس کے جس کو
وَمَا :اور اس کو جس کو
عَلَى النُّصُبِ :استھان پر
تَسْتَقْسِمُوْا :تم تقسیم کرو
ذٰلِكُمْ :یہ
اَلْيَوْمَ :آج کے دن
الَّذِيْنَ :وہ لوگ جنہوں نے
مِنْ دِيْنِكُمْ :تمہارے دین سے
وَاخْشَوْنِ :اور ڈرو مجھ سے
اَكْمَلْتُ :میں نے مکمل کیا
دِيْنَكُمْ :تمہارے دین کو
عَلَيْكُمْ :تم لوگوں پر
وَرَضِيْتُ :اور میں راضی ہوا
الْاِسْلَامَ :اسلام سے
فَمَنِ :پھر جو
فِيْ مَخْمَصَةٍ :سخت بھوک کے وقت میں
لِاِثْمٍ :گناہ کے لیے
غَفُوْرٌ :بے انتہا بخشنے والا ہے

عَلَيْكُمْ :تم پر
وَالدَّمُ :اور خون کو
وَمَآ :اور اس کو
لِغَيْرِ اللّٰهِ :غیر اللہ کے لیے
وَالْمُنْخَنِقَةُ :اور گلا گھٹ کر مرنے والے کو
وَالْمُتَرَدِّيَةُ :اور گڑھے میں گرنے والے کو
وَمَآ :اور اس کو جس کو
السَّبُعُ :درندے نے
ذَكَّيْتُمْ :اچھی طرح ذبح کیا تم نے
ذُبِحَ :ذبح کیا گیا
وَاَنْ :اور یہ کہ
بِالْاَزْلَامِ :فال نکالنے کے تیروں سے
فِسْقٌ :نافرمانی ہے
يَئِسَ :مایوس ہوئے
كَفَرُوْا :کفر کیا
فَلَا تَخْشَوْهُمْ :پس تم مت ڈرو ان سے
اَلْيَوْمَ :آج کے دن
لَكُمْ :تمہارے لیے
وَاَتْمَمْتُ :اور میں نے تمام کر دیا
نِعْمَتِيْ :اپنی نعمت کو
لَكُمُ :تمہارے لیے
دِيْنًا :بطور دین کے
اضْطُرَّ :لاچار کیا گیا
غَيْرَ مُتَجَانِفٍ :مائل ہونے والا ہوئے بغیر
فَاِنَّ اللّٰهَ :تو یقیناً اللہ
رَّحِيْمٌ :ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

نوٹ :اسلام سے کافروں کی مایوسی کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کی یہ توقع ختم ہوگئی کہ وہ اسلام میں کچھ خلط ملط کرسکیں یا اپنے دین کو اسلام میں گڈمڈ کرلیں۔ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں نازل ہوئی۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اکیاسی (۸۱) دن حیات رہے۔(ابن کثیر) اس آیت کے نزول کے بعد کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا۔ جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں ان میں یا تو ترغیب وترہیب کے مضامین تھے یا انہی احکام کی تاکید تھی جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا۔(معارف القرآن)

آیات ۴۔۵

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ ع

ج ر ح

جَرَحَ يَجْرَحُ (ف) جَرْحًا: (۱) کمانا' (۲) زخمی کرنا۔﴿وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام:۶۰) ''اور وہ جانتا ہے جو تم لوگ کماتے ہو دن میں۔''

جُرْحٌ ج جُرُوْحٌ (اسم ذات) : زخم۔﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ﴾(المائدۃ:۴۵)''اور زخموں میں بدلہ ہے۔''

جَارِحَةٌ ج جَوَارِحُ (اسم الفاعل جَارِحٌ کا مؤنث) :زخمی کرنے والا' درندہ۔آیت زیر مطالعہ۔

اِجْتَرَحَ (افتعال) اِجْتِرَاحًا: اہتمام سے کمانا۔﴿اَلَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ﴾(الجاثیۃ:۲۱)''جنہوں نے کمائیں برائیاں۔''

ك ل ب

كَلَبَ يَكْلِبُ (ض) كَلْبًا :کتے کی طرح آواز نکالنا' بھونکنا۔

كَلْبٌ (اسم ذات) : کتا۔﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ﴾ (الاعراف:۱۷۶)''پس اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے۔''

كَلَّبَ (تفعیل) تَكْلِيْبًا :کتوں کو شکار کے لیے سدھانا۔

مُكَلِّبٌ (اسم الفاعل) :سدھانے والا۔

ترکیب

''اُحِلَّ'' کا نائب فاعل ''اَلطَّیِّبٰتُ'' اور ''وَمَا'' ہیں۔ ''مُکَلِّبِیْنَ'' حال ہے۔ ''تُعَلِّمُوْنَھُنَّ'' میں ''ھُنَّ'' کی ضمیر ''اَلْجَوَارِحِ'' کے لیے ہے۔ دونوں جگہ ''طَعَامُ'' اپنے مضاف الیہ کے ساتھ مل کر مبتدأ ہے اور ''حِلٌّ'' ان کی خبریں ہیں' جبکہ ''لَکُمْ'' اور ''لَھُمْ'' متعلق خبر ہیں۔ ''وَالْمُحْصَنٰتُ'' سے ''اَخْدَانٍ'' تک پورا فقرہ ''حِلٌّ لَّکُمْ'' پر عطف ہے' جس میں مخاطب اہل ایمان ہیں' اور ''حَلٌّ لَّھُمْ'' پر نہیں ہے' جس میں غائب کی ضمیر اہل کتاب کے لیے ہے' کیونکہ ''اِذَا'' شرطیہ کے بعد ''اٰتَیْتُمُوْھُنَّ'' آیا ہے' جو جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہوگا کہ اے ایمان والو! جب تم ان عورتوں کو ان کے حقوق دے دو تو وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ ''مُحْصِنِیْنَ'' اور ''مُسٰفِحِیْنَ'' حال ہیں۔ ''مُتَّخِذِیْ'' دراصل ''مُتَّخِذِیْنَ'' ہے' مضاف ہونے کی وجہ سے اس کا نون گرا ہوا ہے اور یہ بھی حال ہے۔

ترجمہ:

یَسْئَلُوْنَکَ : وہ پوچھتے ہیں آپؐ سے
اُحِلَّ : حلال کی گئی
قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے
لَکُمُ : تمہارے لیے
وَمَا : اور اس کو جو
مِنَ الْجَوَارِحِ : درندوں میں سے
تُعَلِّمُوْنَھُنَّ : تم سکھاتے ہو ان کو
عَلَّمَکُمُ : سکھایا تم کو
فَکُلُوْا : تو تم کھاؤ
اَمْسَکْنَ : انہوں نے تھاما
وَاذْکُرُوا : اور ذکر کرو
عَلَیْہِ : اس پر
اللّٰہَ : اللہ کا
سَرِیْعُ الْحِسَابِ : حساب لینے کا تیز ہے
اُحِلَّ : حلال کیا گیا
الطَّیِّبٰتُ : پاکیزہ (چیزوں) کو
اُوْتُوا : دی گئی
مَاذَآ : وہ کیا ہے جو
لَھُمْ : ان کے لیے
اُحِلَّ : حلال کیا گیا
الطَّیِّبٰتُ : پاکیزہ (چیزوں) کو
عَلَّمْتُمْ : تم نے سکھایا
مُکَلِّبِیْنَ : شکار کے لیے سدھانے والا ہوتے ہوئے
مِمَّا : اس میں سے جو
اللّٰہُ : اللہ نے
مِمَّآ : اس میں سے جو
عَلَیْکُمْ : تمہارے لیے
اسْمَ اللّٰہِ : اللہ کے نام کا
وَاتَّقُوا : اور تقویٰ کرو
اِنَّ اللّٰہَ : یقیناً اللہ
اَلْیَوْمَ : آج کے دن
لَکُمُ : تمہارے لیے
وَطَعَامُ الَّذِیْنَ : اور ان کا کھانا جن کو
الْکِتٰبَ : کتاب

حِلٌّ: حلال ہے
وَطَعَامُكُمْ :اورتمہارا کھانا
لَّهُمْ:ان کے لیے
مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ:مسلمان عورتوں میں سے
مِنَ الَّذِيْنَ :ان میں سے جن کو
الْكِتٰبَ :کتاب
اِذَآ :جب
اُجُوْرَهُنَّ :ان کے حقوق
غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ :بدکاری نہ کرنے والا ہوتے ہوئے
وَمَنْ يَّكْفُرْ :اور جو انکار کرتا ہے
فَقَدْ حَبِطَ :تو اکارت ہو چکے ہیں
وَهُوَ :اور وہ ہے
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ:خسارہ پانے والوں میں سے

لَّكُمْ :تمہارے لیے
حِلٌّ : حلال ہے
وَالْمُحْصَنٰتُ:اور خاندانی عورتیں
وَالْمُحْصَنٰتُ :اور خاندانی عورتیں
اُوْتُوا :دی گئی
مِنْ قَبْلِكُمْ :تم سے پہلے (حلال ہیں تمہارے لیے)
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ :تم دو ان کو
مُحْصِنِيْنَ:حفاظت کرنے والا ہوتے ہوئے
وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ : اور نہ ہی یاری بنانے والا ہوتے ہوئے
بِالْاِيْمَانِ :ایمان کا
عَمَلُهٗ:اس کے عمل
فِي الْاٰخِرَةِ :آخرت میں

❁❁❁

بقیہ: کتاب نما

مسلمانوں میں بعض لوگ شرکیہ اعمال کرتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کے خلاف شدید ردّعمل ظاہر کرتے ہوئے انہیں مشرک کہنا مناسب نہیں۔ وہ مسلمان ہیں' مگر ان کے شرکیہ اعمال گناہ کبیرہ ہیں اور گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہو جاتا۔ اہم دینی فیصلے قرآن وسنت کے مطابق اختیار کرنے میں کسی مسلمان کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بدعات ضرور قابل اعتراض ہیں اور ان کی مذمت خود قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ مصنف چونکہ پاکستانی مسلمان ہے اس لیے اس کی نظر زیادہ تر پاکستانی مسلمانوں کے طرزِ عمل پر ہے۔

صاحبِ کتاب اس امر پر خصوصی زور دیتے ہیں کہ علماء کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان پیار ومحبت' سلوک واتفاق اور برداشت کے جذبات پروان چڑھائیں اور اپنی تقاریر قرآن وسنت اور تعاملِ صحابہ تک محدود رکھیں۔ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ کتاب وسنت کو اپنے بیانات میں اوّلیت دیں' کسی فرقے کی وکالت نہ کریں۔ اجتہادی مسائل میں لوگوں کو کسی ایک مجتہد کی پیروی پر مجبور نہ کریں۔ جہاں تک اسلامی ممالک کے سربراہان کا تعلق ہے' انہیں چاہیے کہ وہ متحد ہو کر پورے خلوص کے ساتھ اُمت کو درپیش مسائل اور مشکلات پر غور کریں اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی طرف پیش قدمی کا آغاز کریں۔

عامۃ المسلمین اپنا اپنا مخصوص اسلامی فرقہ چھوڑیں اور کسی دوسرے فرقہ میں شامل نہ ہوں' بلکہ صرف مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے کو پسند کریں اور عقیدہ اور عمل میں خیر القرون کو مثال بنائیں۔ المختصر یہ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے جس کی ایک ایک سطر سے مصنف کا دردِ دل جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ (تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

سیرتُ النّبی ﷺ کا ایک اہم واقعہ

غزوۂ اَحزاب

پس منظر' واقعات' اسباب وعوامل اور نتائج واثرات

(منتخب اردو تفاسیر کی روشنی میں)

محمد انس حسان ☆

غزوۂ اَحزاب کی وجہ تسمیہ

اَحزاب' حِزب کی جمع ہے۔عربی لغت کے لحاظ سے اس کے معنی طائفہ' گروہ یا جماعت کے ہیں۔احزاب کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ ہر وہ قوم جس کے خیالات وافکار ایک ہوں اگر چہ آپس میں ملاقات نہ ہوئی ہو' اسے حزب کہتے ہیں (۱)۔اس غزوہ کا دوسرا نام غزوۂ خندق بھی ہے۔خندق' خنادق کا واحد ہے۔اس کا معنی گڑھا یا کھوہ ہے (۲)۔اس کو غزوۂ خندق کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس جنگ میں کفار سے دفاع کے لیے مدینہ منورہ کے اردگرد خندقیں کھودی گئی تھیں۔یہ خندق صحابی رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے کھودی گئی تھی۔

چونکہ کفارِ مکہ اور قبائل یہود پہلی دفعہ اپنی مکمل جمعیت اور تمام گروہوں کے ساتھ اسلام کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تھے اسی لیے اس کو غزوۂ احزاب یعنی مختلف گروہوں کی اتحادی پارٹی کے خلاف جنگ سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس حوالہ سے سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اسے غزوۂ احزاب اور غزوۂ خندق کہتے ہیں جو وقوعِ ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال ہوا تھا۔''(۳)

قرآن مجید میں غزوۂ احزاب کا ذکر

قرآن مجید میں غزوۂ احزاب کے حوالے سے سورۃ الاحزاب کا نزول ہوا' جس کے پورے دو رکوع غزوۂ احزاب کے حالات وواقعات پر مشتمل ہیں۔ان میں چند آیات درج ذیل ہیں:

(۱) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۝۹﴾

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اُس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر' پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔اور اللہ تعالیٰ جو

☆ لیکچرار گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں

کچھ تم کر رہے تھے اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔''

(۲) ﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱﴾

''جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے۔ اس موقع پر خوب آزما لیا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔''

(۳) ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝۲۳﴾

''اہل ایمان میں ایسے جواں مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ پس ان سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعض (اس ساعت سعید کا) انتظار کر رہے ہیں۔ (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویے میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی۔''

(۴) ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ﴾ (آیت ۲۵)

''اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآں حال کہ وہ اپنے غصہ میں (پیچ و تاب کھا رہے) تھے' (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور بچا لیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جنگ سے۔''

غزوۂ اَحزاب کا پس منظر

غزوۂ احزاب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: جنگ اُحد (شوال ۳ھ) میں نبی اکرم ﷺ کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست ہوئی تھی اس کی وجہ سے مشرکین عرب' یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انہیں امید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو احد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ (۴)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: غزوۂ احزاب شوال ۵ھ میں واقع ہوا..... تقریباً دس ہزار کا ایک لشکر جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قریش کا لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں تھا اور غطفان و ہوازن' عیینہ بن حصن اور عامر بن طفیل کی قیادت میں نکلے' مزید برآں حُیَیّ بن اخطب نضری نے یہود بنی قریظہ کو بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا' لیکن اس موقع کو انہوں نے غنیمت جانا اور معاہدے کی پروانہ کی۔ (۵)

پیر کرم شاہ الازہریؒ غزوۂ احزاب کا پس منظر کچھ اس انداز میں پیش فرماتے ہیں: مدینہ منورہ میں یہود کے دو مشہور قبیلے آباد تھے' بنی نضیر اور بنی قریظہ۔ اگرچہ حضور پاک ﷺ نے مدینہ منورہ میں پہنچتے ہی ان سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا تھا' لیکن ان کے دلوں میں اسلام سے عداوت کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے..... دوستی کے معاہدے کے باوجود بنی نضیر نے حضور پاک ﷺ کو شہید کرنے کی ناپاک سازش کی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔

اس عہد شکنی اور غداری کے باعث حضور پاک ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ (۶)

مفتی محمد شفیعؒ غزوۂ احزاب کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جس سال مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے اس کے دوسرے ہی سال میں غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ تیسرے سال میں غزوۂ احد پیش آیا۔ چوتھے سال میں یہ غزوۂ احزاب واقع ہوا اور بعض روایات میں اس کو پانچویں سال کا واقعہ قرار دیا ہے۔ (۷)

غزوۂ احزاب کے پس منظر کے حوالہ سے مفسّرین کے متفرق نکات درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا مودودیؒ کے نزدیک غزوۂ احزاب کے پس منظر میں مشرکین عرب اور یہود کی وعدہ خلافیوں اور اسلام دشمنی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہود تو اسلام دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کر لی تھی' تاکہ اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ (۸)

(۲) مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے مطابق یہ غزوہ ۵ ہجری میں ہوا تھا۔ اس میں کل دس ہزار کفار نے شرکت کی اور ان کی سربراہی ابوسفیان نے کی تھی' نیز قبیلہ بنوقریظہ جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ معاہدہ کا پابند تھا وہ بھی چپکے سے اس محاذ کا حصہ بن گیا تھا۔ (۹)

(۳) پیر کرم شاہ الازہریؒ اس غزوہ کا محرک یہودی قبائل کو قرار دیتے ہیں (۱۰)۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس غزوہ کی منصوبہ بندی میں یہودی قبائل نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی سازش بھی کی۔

(۴) مفتی محمد شفیعؒ کے نزدیک یہ غزوہ دراصل غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کے ساتھ ملا ہوا ہے اور دونوں غزوات پر نظر ہونے سے اس غزوہ کا پس منظر واضح ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کے نزدیک یہ غزوہ مسلمانوں اور خود نبی کریم ﷺ کے لیے بڑا سخت تھا (۱۱)۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمان بالکل بے سروسامانی کی کیفیت میں تھے۔ اس کے برعکس اصحابِ احزاب اسلحہ سے لیس اور بہت بڑی جمعیت کے ساتھ آئے تھے (۱۲)۔ تاہم مسلمانوں کو صبر و استقامت کے باعث فتح نصیب ہوئی۔

غزوۂ احزاب کے واقعات

۱) مشرکین مکہ کی روانگی: رسول اللہ ﷺ کو کفار کے لشکر کی روانگی کی خبر بنوخزاعہ کے چند نوجوانوں نے دے دی تھی۔ آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو جمع کر کے لشکر کفار کی اطلاع دی اور مشورہ طلب کیا۔ اس حوالہ سے پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ رقمطراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بھی اپنے دشمنوں کے عزائم سے بے خبر نہیں تھا۔ مختلف قبائل میں حضور ﷺ کے جو غلام تھے انہوں نے ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا (۱۳)۔ مولانا مودودیؒ اس حوالہ سے فرماتے ہیں کہ یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کن ہوتا' لیکن نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے' بلکہ آپؐ کے خبر رساں اور تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے' قبل اس کے کہ یہ جم غفیر آپ ﷺ کے شہر پہنچتا (۱۴)۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس متحدہ محاذ کے حرکت میں آنے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلا کلمہ جو زبانِ مبارک

پر آیا' یہ تھا: حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل یعنی ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔(۱۵)

۲) مسلمانوں کی مشاورت: جب رسول اللہ ﷺ کو کفار کے لشکر کشی کی خبر ملی تو آپؐ نے تمام مہاجرین اور انصار کو بلا کر مشورہ کیا کہ مدینہ کا دفاع کیسے کیا جائے؟ مختلف صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں اور اکثریت نے اس بات کی تائید کی کہ اپنا دفاع مدینہ منورہ کے اندر ہی رہ کر کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کئی تدابیر سامنے آئیں' بالآخر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

''یارسول اللہ ﷺ! ہم فارس والے اکثر جنگیں اپنے دفاع کے لیے لڑتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت جو فضا اور اطلاعات کفار کے لشکر جرار کی ہیں اس کے لیے سب سے بہترین بات یہ ہے کہ مقابلہ مدینہ سے باہر کسی میدان میں کرنے کی بجائے مدینہ منورہ کے اندر ہی رہ کر کیا جائے اور اس کے لیے تمام غیر محفوظ مقامات پر خندقیں کھود دی جائیں اور پھر اندر محصور رہ کر کفار کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی رائے کو سب صحابہؓ اور خود جناب رسول کریم ﷺ نے پسند فرمایا۔''(۱۶)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ کے مطابق نبی کریم ﷺ نے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا اور شہر کی اس جانب جدھر سے چڑھائی کا خدشہ تھا خندق کھودنے کے لیے نشانات لگا دیے۔(۱۷)

مولانا مودودیؒ اس حوالہ سے رقمطراز ہیں:

''آپ ﷺ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمال غربی رخ پر ایک خندق کھدوالی اور کوہ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا۔''(۱۸)

اس ضمن میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''مہاجرین وانصار کے اہلِ حل وعقد کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیا۔ اگرچہ صاحبِ وحی کو درحقیقت مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ براہ راست حق تعالیٰ کے اِذن واجازت سے کام کرتے ہیں' مگر مشورے میں دو فائدے تھے: ایک اُمت کے لیے مشورہ کی سنت جاری کرنا' دوسرے قلوبِ مؤمنین میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید اور تعاون وتناصر کا جذبہ بیدار کرنا۔''(۱۹)

۳) خندق کی کھدائی: حضور ﷺ نے پہاڑ کے قریب اپنا خیمہ لگا دیا۔ پھر آپؐ نے خندق کی کھدائی کے نشانات لگا کر اسے منقسم کر دیا۔ ہر دس آدمیوں کے حصہ میں چالیس گز خندق کی کھدائی آئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود آپ ﷺ بھی خندق کھودنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے کے مطابق مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے جو تدبیر اختیار کی گئی کہ خندق کے ذریعے اپنی اور اپنے شہر کی حفاظت کی جائے' اس بارے میں پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''حضرت سلمان (فارسیؓ) نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ!..... مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھود دی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا اور شہر کے اس جانب جدھر سے چڑھائی کا خدشہ تھا'

خندق کھودنے کے لیے نشانات لگا دیے گئے۔ ہر دس آدمی کو چالیس گز خندق کھودنے کا فریضہ سونپا گیا۔ خندق کھودنے کے کام میں سب مسلمان شریک تھے' کوئی مستثنیٰ نہ تھا۔ فخر دو جہاں' سرورِ کون ومکان اپنے دست مبارک میں کُدال لیے اپنے غلاموں کے دوش بدوش خندق کھودنے میں مصروف تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ کہتے ہیں کہ شکم مبارک کے بال مٹی سے اَٹ گئے تھے اور جلد مبارک دکھائی نہیں دیتی تھی۔''(۲۰)

مولانا مودودی کے مطابق اہل عرب اس جنگی تدبیر سے واقف ہی نہیں تھے کہ ہمیں خندق کا سامنا ہوسکتا ہے جو عبور کرنا ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گا۔ اور اوپر سے سخت سردی کا موسم' انہوں نے اس کا سامنا بھی کرنا تھا۔(۲۱)

مفتی محمد شفیع صاحب کے مطابق اس خندق کے نشانات خود رسول اللہ ﷺ نے لگائے کہ کہاں سے شروع کی جائے اور کس جگہ اس کو ختم کرنا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں:

''اس خندق کی کل لمبائی تقریباً ساڑھے تین میل تھی۔ چوڑائی اور گہرائی کی صحیح مقدار کسی روایت سے معلوم نہیں ہوئی' لیکن یہ ظاہر ہے کہ چوڑائی اور گہرائی بھی خاصی ہوگی جس کو عبور کرنا دشمن کے لیے آسان نہ ہو۔''(۲۲)

۴) خندق کی کھدائی میں پیش آنے والے واقعات:

(الف) خندق کی کھدائی کے دوران ایک چٹان کھدائی میں رکاوٹ بن گئی۔ مسلمانوں نے اسے توڑنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ چٹان اپنی جگہ سے نہ ہلی اور جوں کی توں قائم رہی۔ اس پر مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کو سارا واقعہ بتایا تو آپؐ نے بنفس نفیس خود اس کو توڑا۔ اس سارے واقعہ کو پیر محمد کرم شاہ الازہری نے حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کے ذیل میں درج کیا ہے۔

''عمرو بن عوف کہتے ہیں کہ میں' سلمان' حذیفہ' نعمان بن مقرن المزنی اور چھ انصاری اپنے حصہ کی چالیس گز خندق کھود رہے تھے تو اتفاق سے ایک چٹان آ گئی۔ ہم نے سارا زور لگایا۔ بڑے جتن کیے لیکن وہ نہ ٹوٹی۔ میں نے حضرت سلمانؓ سے کہا کہ آپ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کریں' تاکہ جو ارشاد ہو اس پر عمل کیا جائے۔ حضرت سلمانؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور چٹان کے متعلق گزارش کی کہ ہمارے بازو شل ہوگئے ہیں' ہماری کدالیں کند ہوگئی ہیں' لیکن وہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ یہ سن کر حضور ﷺ خود اٹھے اور اس جگہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر حضرت سلمانؓ کے ہاتھ سے گینتی پکڑی اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ضرب لگائی۔ اس سے اتنی روشنی پیدا ہوئی جیسے کسی نے گھپ اندھیرے میں اچانک چراغ جلا دیا ہو اور اس کا تیسرا حصہ ٹوٹ کر الگ جا گرا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((**اللہ اکبر اعطیتُ مفاتیح الشام**)) ''مجھے ملکِ شام کی کنجیاں دے دی گئیں''۔ دوسری مرتبہ پھر حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ضرب لگائی' پھر اسی طرح روشنی نمودار ہوئی اور دوسرا حصہ ٹوٹ گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((**اعطیتُ مفاتیح فارس**)) ''مجھے ملکِ ایران کی کنجیاں بخش دی گئیں''۔ تیسری مرتبہ چوٹ لگائی' باقی ماندہ چٹان بھی ریزہ ریزہ ہوگئی اور حضور ﷺ نے فرمایا: ((**اللہ اکبر اعطیت مفاتیح الیمن**)) ''مجھے یمن کی کنجیاں مرحمت کر دی گئیں''۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے اپنی ضربوں سے نہ صرف اس چٹان کو پارہ پارہ کر دیا' بلکہ دنیا کی دو بڑی عالمی طاقتوں روم اور ایران کے سنگین قلعوں کو بھی

ہلا کر رکھ دیا اور ان ممالک کی فتح کی نوید بھی اپنے غلاموں کو سنا دی۔‘‘(۲۳)

یہ تو واقعہ کی وہ تفصیل ہے جسے مفسر ’’ضیاء القرآن‘‘ نے بیان کیا ہے‘ لیکن مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے پہلی ضرب لگائی تو یہ آیت پڑھی: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ (یعنی پوری ہوگئی نعمت آپ کے رب کی سچائی کے ساتھ) جبکہ دوسری ضرب کے دوران آپ ﷺ نے آیت مذکورہ کو آخر تک پڑھا۔(۲۴)

مفسر ضیاء القرآن کے مطابق فتوحات کی یہ بشارتیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پوری ہوئیں اور یوں آپ ﷺ کا وعدہ مکمل ہوا۔(۲۵) مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

(ب) خندق کی کھدائی کے دوران جو دوسرا مشہور واقعہ پیش آیا وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوتِ طعام میں نبی کریم ﷺ کا ایک کھلا ہوا معجزہ کہلاتا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ دورانِ کھدائی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر یوں محسوس کیا کہ بھوک کی وجہ سے آپ متاثر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ گھر جا کر اپنی اہلیہ سے کہا کہ حضور پاک پر بھوک کا اثر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اس لیے اگر گھر میں کچھ ہے تو پکا لو۔ اس پر آپ کی اہلیہ نے جواب دیا ایک صاع بھر جو رکھے ہیں میں انہیں پیس کر آٹا بناتی ہوں۔ حضرت جابرؓ نے گھر میں موجود ایک بکری کے بچے کو ذبح کیا اور کھانا تیار کر کے نبی کریم ﷺ کے لیے لے چلے۔ اس پر اہلیہ نے پکار کر کہا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بہت مجمع ہوگا اس لیے آپ انہیں علیحدہ بلا کر دعوت دیجیے گا۔ ایسا نہ ہو بھرے مجمع میں‘ میں رسوا ہو جاؤں۔ حضرت جابرؓ نے ساری صورتحال گوش گزار کر دی اور اصل حقیقت اور کھانے کی مقدار بھی بتا دی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس پر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یوں روشنی ڈالی ہے:

’’خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے روٹی اور سالن سب کو دینے اور کھلانے کا اہتمام فرمایا اور پورے مجمع نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سب مجمع کے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ ہماری ہنڈیا میں سے کچھ گوشت کم نظر آتا تھا اور نہ گوندھے ہوئے آٹے میں کوئی کمی معلوم ہوتی تھی۔ ہم سب گھر والوں نے بھی شکم سیر ہو کر کھایا۔ باقی پڑوسیوں میں تقسیم کر دیا۔‘‘(۲۶)

باقی تینوں مفسرین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔

۵) منافقین کا کردار: غزوۂ احزاب کے موقع پر جب مسلمانوں پر آزمائش اور ابتلاء کا ایک کٹھن مرحلہ آ پہنچا تھا‘ اس موقع پر منافقین نے اپنے منفی کردار کے ذریعے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس موقع پر جبکہ مسلمان انتہائی مشکل میں گھرے ہوئے تھے‘ منافقین میں سے بعض نے یہ پھبتی کسی کہ ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے کیے جاتے ہیں‘ لیکن حالت یہ ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لیے باہر تک نہیں جا سکتے۔ اس واقعہ کو سورۃ الاحزاب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲﴾

’’اور اُس وقت کہنے لگے تھے منافق اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے (فتح کا) اللہ اور اُس کے رسولؐ نے مگر صرف دھوکہ دینے کے لیے۔‘‘

اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مفسّر تدبّر قرآن لکھتے ہیں:

''جو منافق اور اسلام کے خلاف بغض وعناد رکھنے والے تھے' انہوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے' ان کے اندر یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدے کیے وہ سب محض فریب ثابت ہوئے۔ روایات میں اس گروہ کے بعض اشرار کی یہ پھبتی بھی نقل ہوئی ہے کہ ''محمد (ﷺ) تو ہمیں یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں پر قبضہ کریں گے اور یہاں حال یہ ہے کہ گھر سے قضائے حاجت کے لیے نکلنا ناممکن ہو رہا ہے۔''(۲۷)

مولانا مزید لکھتے ہیں:

''غور کیجیے کہ ایک طرف دشمنوں کا ہر سمت سے شہر کا محاصرہ اور دوسری طرف منافقین کا مسلمانوں کے اندر یہ زہریلا پروپیگنڈا! اسی صورتِ حال کو قرآن نے ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔''(۲۸)

منافقین کی ایک منفی سرگرمی یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ قرآن مجید نے اس پر یوں تبصرہ کیا:

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۭ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ⑬﴾ (الاحزاب)

''اور یاد کرو جب کہتی پھرتی تھی ان میں سے ایک جماعت: اے یثرب والو! تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں' (جان عزیز ہے) تو لوٹ چلو (اپنے گھروں کو)۔ اور اجازت مانگنے لگا ان میں سے ایک گروہ نبی کریم (ﷺ) سے یہ کہہ کر کہ (حضورؐ) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں' حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے' اس بہانہ سازی سے ان کا ارادہ محض (میدانِ جنگ سے) فرار تھا۔''

مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں کہ منافقین کی سرگرمیاں مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلانے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ وہ تو انہیں یہ مشورے بھی دینے لگے تھے کہ جان کی ضرورت ہے تو میدان چھوڑ کر چپکے سے گھر واپس چلے جاؤ(۲۹)۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مطابق گھروں کو لوٹ چلنے کا مشورہ اوس بن قیظی نے دیا تھا(۳۰)۔ ان کے مطابق بعضے لوگ (ان منافقوں میں) نبی ﷺ سے (اپنے گھر واپس جانے کی) اجازت مانگتے تھے' کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں (یعنی صرف عورتیں' بچے رہ گئے' دیواریں قابل اطمینان نہیں' کہیں چور نہ آ گھسیں)۔ یہ قول ابوعرابہ اور دوسرے بنی حارثہ کا تھا۔(۳۱)

منافقین کو دراصل کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ اندرونِ خانہ وہ یہود کے ساتھ ساز باز کر چکے تھے اور محض مسلمانوں کی طاقت میں رخنہ ڈالنے کے لیے اس طرح بے سروپا باتیں پھیلا رہے تھے۔ اسی کو مولانا مودودیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب آیت ۱۴ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اگر شہر میں داخل ہو کر فاتح کفار ان منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ختم کر دو (تو وہ ایسا ضرور کرتے)۔''(۳۲)

۶) مدینہ کا محاصرہ: اصحابِ احزاب جب مدینہ کے قریب پہنچے تو اپنے راستے میں ایک وسیع خندق کو حائل پایا۔

یہ بات ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی اور وہ اس صورت حال کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ اس پر ابوسفیان نے طعنہ زنی کی کہ مقابلے کی بجائے عجیب قسم کے قلعوں میں گھس گئے ہو۔ اور بلند آواز سے پوچھا اے مسلمانو! تم نے یہ داؤ کہاں سے سیکھا ہے؟ اس پر آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ چیز الہام کی ہے۔ (۳۳)
اس پر کفار نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس محاصرے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا' لیکن اس دوران میں سنگ باری اور تیراندازی کے اِکا دُکا واقعات کے سوا دو بدو جنگ کی کوئی نوبت نہیں آئی۔ دشمن نے یہ اندازہ کر لیا کہ مسلمانوں نے مدافعت کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔'' (۳۴)

مفسّر ضیاء القرآن اصحابِ احزاب کے لیے خندق کی غیر متوقع رکاوٹ پر متعجب ہونے پر یوں رقمطراز ہیں:

''انہوں نے جب اپنے سامنے اتنی چوڑی اور گہری خندق دیکھی تو حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ ان کی جنگی منصوبہ بندی میں ایسی تدابیر کا سان گمان بھی نہ تھا۔ مجبوراً خندق کی دوسری طرف ہی انہوں نے اپنے خیمے نصب کر لیے اور مسلمانوں کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ اور حملے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔'' (۳۵)

غزوۂ احزاب میں اگر کفار کا گروہ اچانک حملہ آور ہوتا تو بہت نقصان ہوتا' لیکن نبی کریم ﷺ کی بصیرت سے مدینہ کے اردگرد خندق کی کھدائی نے کفار کو سخت متعجب کر دیا۔ چونکہ وہ اس طریق جنگ سے ناآشنا تھے اس لیے انہیں سخت صعوبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حوالہ سے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انہیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا' کیونکہ اہل عرب اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔'' (۳۶)

۷) بنوقریظہ کی بدعہدی: ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہود کے تین قبیلے بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ آباد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی ان کے ساتھ امن معاہدے کیے۔ بنوقینقاع اور بنونضیر تو پہلے ہی اپنی بدعہدی کی وجہ سے جلاوطنی اختیار کر چکے تھے۔ قبیلہ بنونضیر کے سردار حُیّی بن اخطب کی ناپاک کوششوں سے احزاب نے مدینہ پر چڑھائی کا پروگرام بنایا تھا۔ اب ان سب کی کوشش یہ تھی کہ کسی طریقے سے بنوقریظہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جائے تاکہ مسلمانوں کا قلع قمع کیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بنوقریظہ کو اپنے ساتھ ملانے کا کام حیی بن اخطب کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ وہ احزاب کے پہنچنے سے پہلے بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا تو اُس نے ملنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں مسلمانوں سے امن کا معاہدہ کر چکا ہوں' میں اس کو نہیں توڑ سکتا' تم واپس چلے جاؤ! تو حُیّی نے طعنہ دیا کہ کھانا نہ کھلانا پڑ جائے اس وجہ سے ملاقات نہیں کر رہا۔ اس پر کعب نے بخل کے الزام سے بچنے کے لیے دروازہ کھولا۔ تو جب یہ دونوں تنہا ہوئے تو حُیّی نے کعب سے یہ کہا:

''اے کعب! میں تمہارے پاس زمانے بھر کی عزت لے کر آیا ہوں..... اس موقع کو غنیمت جانو اور ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ ہم باہر سے حملہ کریں اور تم پشت کی طرف سے ہلہ بول دینا۔ کعب نے پہلے تو صاف صاف انکار کر دیا..... میں معاہدہ کو توڑنا نہیں چاہتا' لیکن حیی اس کو عہد شکنی پر برانگیختہ کرتا رہا یہاں

تک کہ وہ کامیاب ہوگیا اور کعب نے آخر کار مسلمانوں سے دوستی کے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ دیا اور حُیَیّ اور لشکر کفار کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کردی۔‘‘(۳۷)

حضور پاک ﷺ کو بھی اس معاملہ کی خبر مل گئی کہ بنی قریظہ بھی عہد شکنی پر تُل گئے ہیں تو آپؐ نے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو چند دوسرے لوگوں کے ساتھ بھیجا کہ تم بنی قریظہ سے بات کرو اور انہیں سمجھاؤ۔ جب یہ حضرات وہاں پہنچے تو وہاں کے حالات ہی مختلف تھے۔ بنی قریظہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہاں ان کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی۔ تو واپس آ کر انہوں نے اشارتاً آپ ﷺ کو بتا دیا کہ بنی قریظہ وعدہ خلافی کر چکا ہے‘ یعنی جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ احزاب میں کفار کا دس بارہ ہزار کا لشکر جنگی ساز و سامان سے لیس تھا۔ ان کے مقابلے میں تین ہزار مسلمان بے سروسامان تھے۔ اس پر ایک اضافہ یہ بھی ہوگیا کہ بنی قریظہ جس کا مسلمانوں سے امن معاہدہ تھا اس کو بھی کفار اپنے ساتھ شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ذمہ داری حُیَیّ بن اخطب کے ذمہ تھی۔ تو مفتی صاحب اسی حوالہ سے رقمطراز ہیں کہ:

’’(حُیَیّ نے) بنی قریظہ کو وہ سبز باغ دکھائے کہ بالآخر کعب اس کی باتوں میں آ گیا اور احزاب میں شرکت کا وعدہ کرلیا اور کعب نے جب اپنے قبیلہ کے دوسرے سرداروں کو یہ بات بتلائی تو سب نے یک زباں ہو کر کہا کہ تم نے غضب کیا کہ مسلمانوں سے بلاوجہ عہد شکنی کی اور ان کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کعب بھی ان کی بات سے متاثر ہوا اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کیا مگر اب بات اس کے قبضے سے نکل چکی تھی۔‘‘(۳۸)

کفار کا لشکرِ جرار مدینہ کے اردگرد خندق دیکھ کر مبہوت ہوگیا تو اب ان کے لیے صرف ایک تدبیر باقی تھی کہ وہ کسی طریقے سے بنی قریظہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے اور مسلمانوں پر دونوں طرف سے یکبارگی حملہ کرتے۔ اس ناپاک سازش کے لیے حُیَیّ بن اخطب کو چنا گیا کہ انہیں مسلمانوں سے امن معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ اس واقعہ کو مولانا مودودیؒ یوں بیان کرتے ہیں:

’’ابتداءً انہوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (ﷺ) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے..... (لیکن) یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہوگئے۔‘‘(۳۹)

بنی قریظہ کی عہد شکنی کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾﴾ (الاحزاب)

’’اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار لیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا‘ ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔ اور اس

نے وارث بنا دیا تمہیں ان کی زمینوں' ان کے مکانوں اور ان کے مال و متاع کا' اور وہ ملک بھی تمہیں دے دیے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

اس آیت کریمہ کے ضمن میں مولانا اصلاحی بنوقریظہ کی بدعہدی کا حال یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

''جب حُیَیّ بن اخطب نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں تمہی لوگوں کی خاطر تو سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھا لایا ہوں' اگر تمہی نے اس مہم میں ساتھ نہ دیا تو پھر میری اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا! مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینے کا یہ آخری موقع ہے' اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گے اور اس پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ حیی بن اخطب کا یہ جادو کارگر ہو گیا اور بنوقریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شامل ہو گئے۔''(۴۰)

۸) کُفّار کا خندق پار کر کے حملہ کی کوشش: مدینہ منورہ کے اردگرد خندق کی وجہ سے کفار کھل کر حملہ نہ کر سکتے تھے' باہر کھڑے ہو کر پیچ و تاب کھاتے رہتے تھے۔ ایک دن کفار کے چند جوان ایک جگہ کچھ تنگ دیکھ کر اندر داخل ہو گئے۔ ان میں عکرمہ بن ابی جہل' عمرو بن عبدوُدّ عامر بن لوی' ہبیرہ بن ابی وہب' نوفل بن عبداللہ تھے۔ اندر جا کر مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا کہ:

''آج لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ! تم کو آج معلوم ہو جائے گا کہ کون جوان مرد ہے۔''(۴۱)

ان کے مقابلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی۔ پہلے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ پھر انہوں نے تیسری بار جب مقابلے کے لیے آواز دی تو حضرت علیؓ مقابلے میں آئے۔ اس کو پیر کرم شاہ الازہریؒ یوں بیان فرماتے ہیں کہ عبدوُدّ عرب کا مشہور شہ سوار اور جنگجو تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آیا اور یوں مکالمہ ہوا:

''آپؓ نے فرمایا: میں تجھ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آ اور اسلام قبول کر لے۔ اس نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں..... علیؓ کی تلوار صاعقہ بن کر چمکی' اس کے فولادی جسم کو اور اس کی زرہ کو چیرتی ہوئی دشمنِ خدا کے دو ٹکڑے کرتی ہوئی زمین پر آ رکی..... یہی وہ ضربِ حیدری ہے جس نے کفر کے چھکّے چھڑا دیے اور ان کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔''(۴۲)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ لشکر کفار خندق کی وجہ سے بوکھلاہٹ کا شکار تھا' تو ایک دن انہوں نے سوچا کہ کسی بھی طریقے سے آج زوردار حملے کرو اور خندق کے اندر داخل ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دو۔ وہ اس غرض سے خندق کے اردگرد چکر لگانے لگے اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی اور مسلمانوں نے خوب جوابی حملہ کیا۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک روز مقابل کفار نے یہ طے کیا کہ سب مل کر یک بارگی حملہ کرو اور کسی طرح خندق کو عبور کر کے آگے پہنچو۔ یہ طے کر کے بڑی بے جگری سے مسلمانوں کے مقابلے میں آ گئے اور سخت تیر اندازی کی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو دن بھر ایسا مشغول رہنا پڑا کہ نماز کے لیے بھی ذرا سی مہلت نہ ملی۔ چار نمازیں عشاء کے وقت میں پڑھی گئیں۔''(۴۳)

۹) بنی غطفان سے صلح: جب مدینہ کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک پہنچ گیا' سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا' خورد و نوش کی کمی ہو رہی تھی۔ اِدھر بنی قریظہ نے صلح نامہ کو ختم کر دیا' اُدھر باہر سے کفار کی مسلسل تیر اندازی جاری

تھی۔ نبی کریم ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ کسی طریقے سے کفار کے لشکر میں پھوٹ ڈالی جائے اور یہ تتر بتر ہو جائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بنی غطفان کی طرف پیغام بھجوایا کہ ہم مدینہ کی فصل کا ایک ثُلث تمہیں دیں گے اگر تم اپنی تمام جمعیت کے ساتھ واپس چلے جاؤ! (کیونکہ وہ بنی نضیر کے ساتھ بھی اس معاہدے کے تحت آئے تھے کہ وہ خیبر کی نصف فصل دیں گے) تو وہ اس پر آمادہ بھی ہو گئے۔ لیکن پھر حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو صحابہؓ نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو ٹھیک ہے' اگر آپؐ کا مشورہ ہے تو پھر بھی ٹھیک ہے' لیکن اگر آپؐ صرف ہماری تکلیف کو دیکھ کر یہ فیصلہ فرما رہے ہیں تو ہم ان سے جنگ کریں گے' لیکن کھجور کا دانہ بھی خراج کے طور پر نہیں دیں گے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ:

''حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم جس وقت بتوں کو پوجتے تھے' اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے' نہ اُس کی عبادت کرتے تھے' اُس وقت اُن لوگوں کو ہمارے شہر کے پھل میں سے ایک دانہ کی طمع رکھنے کی ہمت نہیں تھی..... ہمیں ان کی مصالحت کی کوئی حاجت نہیں' ہم تو ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے۔''(۴۴)

مولانا مودودیؒ اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

(انصار کے سرداروں سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے کہا) اگر آپؐ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حبہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے' اور اب تو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔''(۴۵)

پیر کرم شاہ الازہریؒ اس حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''انہوں نے عرض کی: اے ہمارے آقا! اگر یہ معاہدہ حضورؐ کو پسند ہے اور خوشی کا باعث ہے تو ہمیں منظور ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تو بھی ہمیں مجالِ انکار نہیں۔ اگر حضورؐ محض ہماری سلامتی کے پیش نظر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو پھر ہم یہ معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔''(۴۶)

اس گفتگو کو سن کر حضور اکرم ﷺ خوش ہو گئے کہ ہمارے صحابہ کرامؓ میں کتنا ایمانی جذبہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ اور بنو غطفان کے سردار عینیہ بن حصن پر رعب طاری ہو گیا کہ مسلمان اتنی پریشانی کے عالم میں بھی زبردست ایمانی طاقت رکھتے ہیں۔

۱۰) کفار کی پسپائی: مدینہ کا محاصرہ جب ایک ماہ تک پہنچ گیا تو بنی غطفان کا ایک شخص نعیم بن مسعود مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں آ گیا اور عرض کی کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرے قبیلے والوں کو اور کسی کو اس کا علم نہیں تو میں آپ کی کیا مدد کروں۔ اس نے کہا کہ میں حیلہ اور تدبیر کے ذریعہ کفار میں پھوٹ ڈال سکتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((الحرب خدعة)) ''جنگ حیلہ اور تدبیر کا نام ہے''۔ تمہیں ہر قسم کی گفتگو کی اجازت ہے۔ تو نعیم سیدھا پہلے بنی قریظہ کے پاس گئے۔ ان کے آپس میں اچھے مراسم تھے۔ اُس نے کہا: بنو قریظہ والو! تم سے بڑی غلطی ہوئی ہے جو تم نے مسلمانوں سے معاہدہ توڑ دیا جب کہ تم اس علاقے کے باشندے ہو' تم نے

ادھر زندگیاں گزارنی ہیں۔تو کیوں مسلمانوں سے دشمنی مول لیتے ہو؟ قریش اور باقی احزاب تو واپس چلے جائیں گے‘ تم کیا کرو گے؟ میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے کفار کے کچھ لوگ یرغمال کے طور پر مانگ لو کہ تم ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ گے‘ بلکہ مسلمانوں کا کام تمام کر کے واپس جاؤ گے۔تو یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ گئی۔پھر نعیمؓ سیدھا قریش کے پاس گئے اور کہا بنی قریظہ مسلمانوں سے معاہدہ توڑ کر پریشان ہیں اور اب وہ مسلمانوں کو دوبارہ اعتبار دلوانے کے لیے آپ کے کچھ معزز لوگ یرغمال کے طور پر لے کر مسلمانوں کو دیں گے۔اور یہ بھی کہا کہ یہ راز کی بات ہے‘ کسی کو پتا نہ چلے۔اس کو مولانا مودودی یوں بیان کرتے ہیں:

’’اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنو قریظہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انہوں نے قرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں‘ اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے۔کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔بنی قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نعیمؓ کی بات سچی تھی۔انہوں نے یرغمال دینے سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیمؓ نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔‘‘(۴۷)

علامہ پیر کرم شاہ الازہری نے کفار کی پسپائی کی ایک وجہ قدرت کی تائید بھی لکھی ہے‘ کیونکہ محاصرہ کفار کو زیادہ کرنا پڑا۔اب ان کے پاس خورد و نوش کا سامان ختم ہونے والا تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

’’جاڑے کا موسم تھا۔بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔سامانِ رسد بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔یہود کے ساتھ تعلقات بھی ٹوٹ چکے تھے۔حوصلے پست اور ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ایک رات سخت آندھی آئی۔ان کے خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں‘ ہانڈیاں الٹ گئیں‘ گھوڑے رسّے تڑا کر بھاگ نکلے‘ سارے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔وہ سمجھے کہ تند و تیز آندھی انہیں تباہ کر کے رکھ دے گی۔ابوسفیان جو اس ساری شرارت کا سرغنہ تھا‘ اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور کہا: یارو! میں تو جا رہا ہوں‘ تم بھی کوچ کرو۔‘‘(۴۸)

جب صبح مسلمان بیدار ہوئے تو دیکھا مدینہ کا مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔لشکر کفار کی جگہ کی طرف دیکھا تو وہاں ٹوٹی ہوئی طنابیں‘ الٹی ہوئی ہانڈیاں‘ بجھی ہوئی آگ اور بکھرے ہوئے سامان کے علاوہ کچھ نہ تھا تو اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))

’’اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔‘‘(۴۹)

مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں پر شدت کی انتہا ہو گئی تو نبی کریم ﷺ نے اَحزابِ کفار کے لیے بددعا کی۔مسلسل تین دن رات مسجد میں فتح کی دعا مانگی تو آپؐ کی دعا قبول ہو گئی۔آپ ﷺ خوش ہوئے اور ساتھیوں کو بھی خوشی کی خبر سنائی۔اس حوالہ سے مفتی صاحب لکھتے ہیں:

’’دشمنوں کی صفوں میں قبیلہ غطفان ایک بڑی طاقت تھی۔حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ نے انہی میں سے ایک شخص نُعیم بن مسعودؓ کے دل میں ایمان ڈال دیا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے

اپنے اسلام کا اظہار کیا..... اس کے ساتھ دوسری آسمانی افتاد ان پر یہ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سخت اور برفانی ہوا ان پر مسلط کر دی..... اس پر مزید اپنے فرشتے بھیج دیے جو باطنی طور پر ان کے دلوں پر رعب طاری کر دیں۔''(۵۰)

قرآن مجید نے کفار کی پسپائی کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝۲۵﴾ (الاحزاب)

''اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآں حال کہ اپنے غصے میں (پیچ وتاب کھا رہے) تھے' (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور بچا لیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جنگ سے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور' ہر چیز پر غالب ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کریمہ کے ضمن میں کفار کی پسپائی اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد احزاب کے شرکاء ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ غصہ اور بغض وعناد سے بھرے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے غصے کے ساتھ ہی ان کو پسپا کر دیا' وہ اس کا کوئی حصہ بھی نکال نہ سکے۔ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا یعنی ان کے منصوبے تو بڑے بڑے تھے' لیکن ان کے کسی منصوبے میں ان کو ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔''(۵۱)

غزوۂ احزاب کے ان واقعات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ معمولی نوعیت کا حامل نہیں تھا بلکہ اس سے مسلمانوں کی آزمائش کا حال معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ اس دوران ہونے والے واقعات کے تسلسل اور فکری نتائج کا بھی پتا چلتا ہے۔

(۱) کفار نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ اس لیے قائم کیا کہ مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو ختم کر دیا جائے۔ اس لشکر کا امیر ابوسفیان کو مقرر کیا گیا اور لشکر کا بڑا جھنڈا عثمان بن طلیحہ کے سپرد کیا گیا۔ یہ عثمان وہی ہیں جن کے پاس بیت اللہ کی چابی تھی۔ بہرحال کفار کا یہ لشکر بڑے شان سے روانہ ہوا۔ دوسری طرف نبی کریم ﷺ بھی مشرکین کے اس عمل سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ آپؐ نے بھی بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔ پیر کرم شاہ الازہری کے مطابق نبی کریم ﷺ کو دشمنوں کے نقل وحمل کے بارے میں ان کے غلام تفصیلات مہیا کر رہے تھے (۵۲)۔ جبکہ مولانا مودودی کے مطابق تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے' وہ آپؐ کو دشمنوں کی حرکات وسکنات سے آگاہ کر رہے تھے۔ (۵۳)

(۲) اس جنگ کا دوسرا مرحلہ جنگ کی حکمت عملی وضع کرنا تھا۔ اس کے لیے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی مشاورتی کمیٹی طلب کی اور ان کے سامنے سارا معاملہ رکھا۔ اس پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا' جسے تمام صحابہؓ نے کثرتِ رائے سے قبول کر لیا۔ مولانا مودودی کے مطابق یہ خندق چھ دن میں تیار ہوگئی اور تین ہزار فوج اس خندق کی پشت پر جنگ کے لیے تیار ہوگئی۔ (۵۴)

(۳) مشرکین کو جب اس خندق سے واسطہ پڑا تو وہ متعجب ہوئے' کیونکہ وہ اس جنگی طریقے سے واقف نہیں تھے اور یہ صورتِ حال ان کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ مولانا مودودی کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں

سردی کے موسم میں طویل مدت تک محاصرہ کے لیے صبر آزما انتظار کرنا پڑا جس کے لیے وہ گھر سے تیار ہوکر نہ آئے تھے۔ (۵۵)

(۴) خندق کی کھدائی کے دوران جب وہ چٹان والا واقعہ پیش آیا تو اس موقع پر نبی کریم ﷺ کا عملی کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے اس چٹان کو پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں کو عالمی فتوحات کی بشارت بھی دی۔ پیر کرم شاہ الازہری کے مطابق یہ بشارتیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مکمل ہوئیں (۵۶) اور ان کے دور میں روم و فارس فتح ہوئے۔

(۵) اس نازک موقع پر جب کہ مسلمانوں کو باہمی اتحاد اور یکجہتی کی سخت ضرورت تھی، منافقین کے گروہ نے اپنا منفی کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ منافقین کے اس کردار پر ویسے تو تمام مفسرین نے خامہ فرسائی کی ہے، تاہم اس موضوع پر سب سے زیادہ تفصیل سے مفسّر تدبّر قرآن یعنی مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے اور بڑی جامعت سے اس کا جائزہ لیا ہے۔

(۶) اصحابِ احزاب کو جب غیر متوقع طور پر خندق سے واسطہ پڑا تو وہ ششدر رہ گئے۔ چنانچہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق انہوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ مولانا اصلاحی کے مطابق یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ (۵۷) اس دوران تیر اندازی کے اکا دکا واقعات تو ہوئے تاہم کفار کو اس سے اتنا اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی مورچہ بندی بہت مضبوط ہے اور وہ پوری حکمت عملی سے چل رہے ہیں۔

(۷) اس دوران ایک اور بڑا اہم واقعہ پیش آیا۔ بنو قریظہ جو ایک یہود قبیلہ تھا اور مسلمانوں کا حلیف تھا، اسے کسی طرح کفار اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی اس بغاوت کا جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے صورتِ احوال جاننے کے لیے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو چند دیگر صحابہ کے ساتھ ان کی طرف بھیجا اور اس کی تاکید فرما دی کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو مجھے محض آنکھ سے اشارہ کر دینا اور لشکر کو اس کی اطلاع نہ دینا، مبادا کہ ان میں مایوسی پھیل جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بنو قریظہ کو بغاوت پر آمادہ پایا اور واپس آ کر نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع بھی دی۔ ہمارے منتخب مفسرین نے اس واقعہ کو نبی کریم ﷺ کی حکمت عملی کا عمدہ نمونہ قرار دیا ہے۔

(۸) اصحابِ احزاب اس طویل محاصرہ سے تنگ آ گئے تھے اور مسلمانوں سے دو بدو جنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے یکبارگی حملہ کرنے کی بھی کوشش کی اور مسلمانوں کو جنگ کے لیے للکارا بھی، لیکن مسلمان نبی کریم ﷺ کے حکم پر چلتے ہوئے کسی قسم کی جذباتیت کا شکار نہیں ہوئے۔ اس موقع پر کفار کا مشہور بہادر عبدوُدّ جو ہزار مردوں پر بھاری مانا جاتا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا کام تمام کر دیا۔

(۹) جب محاصرہ طویل ہوتا گیا تو نبی کریم ﷺ نے کفار میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنو غطفان کو صلح کی پیشکش کی اور انہیں مدینہ کی فصل کا ایک ثلث دینے پر معاہدہ کرنا چاہا۔ اس سارے معاملہ میں دراصل نبی کریم ﷺ مسلمانوں کو کفار سے پہنچنے والے زیادہ سے زیادہ نقصان کو کم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ نے اس بابت صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو ان کا جواب یہ تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو

سر آنکھوں پر لیکن اگر آپ ہمیں بچانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں تو ہم ان سے جنگ کریں گے اور انہیں ایک دانہ بھی خراج نہ دیں گے۔ مفتی محمد شفیع کے مطابق انصار کی طرف سے یہ جواب حضرت سعد بن معاذؓ نے دیا تھا۔(۵۸) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

(۱۰) حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ جو کہ اس غزوہ کے دوران مسلمان ہوئے تھے' انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں ابھی ابھی مسلمان ہوا ہوں۔ اگر دین اسلام کے کسی کام آ سکوں تو بتائیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں اس کام کے لیے تیار کیا کہ وہ کفار میں پھوٹ ڈلوائیں۔ چنانچہ حضرت نعیمؓ نے اپنی حکمت عملی سے کفار میں پھوٹ ڈلوا دی۔

غزوۂ احزاب کے اسباب وعوامل

ویسے تو غزوۂ احزاب کے بہت سے اسباب وعوامل ہیں' تاہم ان میں سے چند اسباب پر ہم روشنی ڈالتے ہیں:

۱) مشرکین کو غزوۂ اُحد کی غلطی کا احساس: غزوۂ اُحد میں مسلمان بظاہر شکست کھا گئے تھے لیکن یہ فتح مشرکین کے سردار ابوسفیان کے لیے اتنی غیر متوقع اور غیر یقینی تھی کہ وہ مسلمانوں کی مکمل بیخ کنی کرنے کی بجائے انتہائی عجلت میں وہیں سے فتح کے شادیانے بجاتا ہوا رخصت ہوا۔ لیکن بعد میں اسے احساس ہوا کہ اس نے جنگی نقطہ نگاہ سے بہت بڑی غلطی کی۔ مسعود مفتی اس حوالہ سے رقمطراز ہیں کہ:

> ''قریش اور ان کے حلیف کے مدینہ سے دور نکلتے ہی مسلمان اپنے گھروں میں آ گئے اور جلد ہی انہوں نے اپنا کھویا ہوا وقار نہ صرف حاصل کر لیا بلکہ اپنے اثرات مشرق میں نجد تک جس میں بئر معونہ اور ذات الرقاع شامل ہیں اور شمال میں دومۃ الجندل کے قریب تک پھیلا دیے۔''(۵۹)

اُحد کا واقعہ ایسا تھا کہ اگر ابوسفیان جلد بازی میں واپس جانے کا فیصلہ نہ کرتا تو شاید تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا۔ اس حوالہ سے مولانا مودودی رقمطراز ہیں کہ:

> ''حضور ﷺ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکر کفار کے تعاقب میں چلنا ہے تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔''(۶۰)

مولانا کے نزدیک یہ لوگ فی الواقع اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے' لیکن یہ سن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ ﷺ ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں(۶۱) چنانچہ انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان پہلے سے بھی زیادہ منظّم ہو گئے۔

۲) یہود کی ریشہ دوانیاں: غزوۂ احزاب کا ایک سبب یہود بنی نضیر کی ریشہ دوانیاں اور اس کے نتیجہ میں ان کی جلاوطنی بھی تھی۔ ماہ ربیع الاول ۴ھ کو رسول اللہ ﷺ اپنے دس' بارہ اصحاب کے ساتھ بنی نضیر کے محلّہ میں تشریف لے گئے' جہاں یہود نے آپس میں گفت وشنید کے دوران منصوبہ بنایا کہ نبی کریم ﷺ کو نعوذ باللہ شہید کر دیا جائے۔ تائید غیبی سے آپ کو اس کا پتا چل گیا اور آپ وہاں سے تشریف لے آئے۔ بعد میں ثابت ہو گیا کہ واقعی یہود نے یہ سازش کی تھی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے یہود کی عہد شکنی کی وجہ سے مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا:

> ''تم ہمارے شہر (مدینہ) سے خارج ہو جاؤ۔ تم نے مجھ (آنحضرت ﷺ) سے غداری کا ارادہ کر کے وہ

معاہدہ خود توڑ دیا جو ہمارے مابین تھا۔ میں تمہیں دس روز کی مہلت دیتا ہوں اور مدت کے گزرنے کے بعد تمہارا جو آدمی یہاں دیکھا جائے گا اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔''(۶۲)

یہود کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی نضیر کے ان لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔(۶۳)

۳) منافقین کا منفی کردار: غزوۂ احزاب کا ایک سبب منافقین کا کردار بھی تھا۔ نبی کریم ﷺ نے یہود کو جلاوطنی کا حکم صادر فرمایا تو وہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یہود کوچ کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی بن سلول کا قاصد ان کے پاس آیا اور پیغام دیا کہ:

''خبردار! جو تم نے جنبش کی' اپنی جگہ ڈٹے رہو۔ ہم محمد اور ان کے ساتھیوں کے خلاف تمہاری ہر طرح سے مدد کریں گے۔''(۶۴)

مدینہ کے منافقین کی اقسام پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ یہ امر یہاں ملحوظِ خاطر رہے کہ منافقین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو محض ضعف عزم و ارادہ کے مریض تھے دوسرے وہ جو اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھتے تھے..... جو لوگ ان دونوں گروہوں کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ بعض مقامات میں قرآن کے الفاظ کا صحیح زور نہیں سمجھ سکتے۔(۶۵)

ان منافقین کے دلوں میں شروع دن سے اسلام کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ موجود تھا' چنانچہ ان لوگوں نے کبھی بھی اسلام کا دل کھول کر ساتھ نہیں دیا۔ ان کے اس رویہ کی قرآن مجید نے بھی نشاندہی کی ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾

''اور اُس وقت کہنے لگے تھے منافق اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے (فتح کا) اللہ اور اس کے رسولؐ نے مگر صرف دھوکہ دینے کے لیے۔''

اس آیت کے حوالے سے مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں کہ جب احزاب کے اجتماع کے وقت پریشانی ہوئی تو یہ لوگ کہنے لگے کہ حالت یہ ہے اور اس پر فتح روم و فارس کی بشارتیں سنا رہے ہیں۔ یہ محض دھوکہ ہے گویا وہ اس کو اللہ کا وعدہ نہ سمجھتے تھے اور نہ آپؐ کو رسول جانتے تھے۔(۶۶) پیر کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں کہ اس قسم کی ہرزہ سرائی میں بشیر بن معتب ایک منافق پیش پیش تھا۔(۶۷) مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ جو منافق اسلام کے خلاف بغض و عناد رکھنے والے تھے انہوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے ان کے اندر یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدے کیے وہ سب محض فریب ثابت ہوئے۔(۶۸)

۴) مؤمنین کی آزمائش: غزوۂ احزاب کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس بات کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے غزوۂ اُحد میں پسپائی سے کیا سبق حاصل کیے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا

وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝۹ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱﴾ (الاحزاب)

''اے ایمان والو! یاد کرو احسان اللہ کا جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر، پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا۔ جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس موقع پر خوب آزما لیا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔''

اس آیت کریمہ کے ضمن میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر مسلمانوں کا (پورا) پورا امتحان کیا گیا (جس میں وہ پورا اترے) اور (سخت) زلزلہ میں ڈالے گئے۔ (۶۹) مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس موقع پر اس تاثر کا رد کرتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر مسلمانوں میں سے چند ایک کے علاوہ کوئی ثابت قدم نہیں رہا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ہم ان تفسیری روایات کو بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ العیاذ باللہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک آدھ آدمیوں کے سوا اور کوئی شخص مسلمانوں میں عزم و ہمت رکھنے والا نہیں نکلا۔ (۷۰) پیر کرم شاہ الازہریؒ کے مطابق آزمائش بڑی سخت تھی، ایک بھونچال تھا، ہر چیز تھر تھر کانپ رہی تھی، لیکن امتحان کی بھٹی سے مسلمان کندن بن کر نکل رہے تھے۔ (۷۱) مولانا مودودیؒ نے بھی یہ بات واضح کی ہے کہ غزوۂ اُحد کی پسپائی کے بعد مسلمانوں میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اگر دوبارہ ان کی آزمائش کی گئی تو وہ اس پر ثابت قدم رہیں گے اور احد کے واقعہ کی تلافی کریں گے۔ (۷۲)

غزوۂ احزاب کے اسباب و عوامل پر غور کرنے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غزوۂ احزاب کسی وقتی یا ہنگامی صورتِ حال میں پیش نہیں آیا بلکہ اس کے پس پشت بہت سے اہم اسباب و عوامل موجود تھے، جن میں سے چند ایک کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ ان اسباب و عوامل سے مندرجہ ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

(۱) غزوۂ اُحد کے بعد مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں کے لیے آزادانہ تجارت کا راستہ بند کر دیا گیا۔ اس معاشی ناکہ بندی نے مشرکین کو یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ اگرچہ احد کے موقع پر مسلمانوں کا مکمل خاتمہ نہ کرنا ہماری فوجی غلطی تھی، لیکن اب اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور ان کے تجارتی قافلوں کو روکا جاتا رہا تو ان کی اجارہ داری اور سرمایہ داری کو ٹھیس پہنچے گی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف حتمی جنگ کا پلان بنایا۔ لیکن گزشتہ غزوات کی وجہ سے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا محض قریش مکہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک اجتماعی فوج کی لشکر کشی کو ضروری سمجھا گیا اور اس کے نتیجے میں غزوۂ اَحزاب وجود میں آیا۔

(۲) مدینہ میں یہود کے جو عرب قبائل موجود تھے انہیں اپنے منفی رویے اور عہد شکنی کی وجہ سے جلاوطنی کی صعوبت

برداشت کرنی پڑی۔ظاہری بات ہے کہ اپنے آبائی علاقے سے نکلنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ان یہود قبائل نے اپنے رویہ پر پشیمان ہونے کی بجائے منفی رویہ اپناتے ہوئے غزوۂ اَحزاب میں بھرپور شرکت کی اور اسلام کو ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

(۳) منافقین جو ہمیشہ سے اپنے دوہرے رویہ کی وجہ سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے تھے' وہ بھی اپنے دوطرفہ رویہ کی وجہ سے غزوۂ اَحزاب کا ایک سبب بنے۔ چنانچہ ان لوگوں نے پس پردہ مشرکین عرب اور یہود قبائل کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوئے ان کا غائبانہ ساتھ دیا۔اور مشکل وقت میں نہ صرف مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ ان کی حوصلہ شکنی میں بھی پیش پیش رہے۔

(۴) مسلمان جو غزوۂ اُحد کی پسپائی کے بعد اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ وہ موقع ملنے پر اس واقعے کی تلافی کر دیں' انہیں غزوۂ اَحزاب کی شکل میں اس بات کا موقع فراہم کیا گیا کہ وہ اس آزمائش میں کس طرح اسلام کی حفاظت کرتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی استقامت اور جفاکشی نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان ان کٹھن حالات میں نہ صرف ثابت قدم رہے بلکہ ہر اندرونی اور بیرونی سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

غزوۂ احزاب کے نتائج واثرات

غزوۂ احزاب اپنی سیاسی اور معاشرتی اہمیت کے حوالہ سے جس طرح ہمہ گیریت اور وسعت کا حامل تھا اسی طرح اس کے نتائج اور اثرات بھی بڑے دوررس اور گہرے برآمد ہوئے۔مسلمان جو غزوۂ احد کی پسپائی کے بعد اپنی اجتماعیت اور فکر کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور یثرب میں اپنے حلیف قبائل اور منافقین کی سازشوں اور اسلام دشمن اقدامات کا سامنا کر رہے تھے' ان کے لیے احزاب کا واقعہ کوئی معمولی حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس نازک کیفیت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱﴾

''جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے۔اس موقع پر خوب آزما لیا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔''

اس آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی اور وہ کس قسم کی مشکلات کا شکار تھے۔تاہم مسلمانوں نے اللہ کی نصرت' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اولوالعزمی سے اس جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ذیل میں ان اثرات ونتائج کا منتخب مفسرین کی آراء کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

۱) کفار کی بالادستی کا خاتمہ: کفار کا لشکر جرار جب مکہ سے چلا تھا تو ان کا خیال تھا کہ ہم جاتے ہی مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے اور مدینہ پر قبضہ کر کے واپس آئیں گے' لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔جب نصرتِ الٰہی نے مسلمانوں کی ہمت وحوصلہ کی مدد کی تو کفار کو ناکام ہو کر بدحواسی کے عالم میں واپس آنا پڑا اور ان

کی بالادستی کا اس طرح خاتمہ ہوا۔ پھر ان کو مسلمانوں پر حملہ کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کو مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ احزاب کے واپس جانے کے وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ اِلَيْهِمْ ''اب وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے' بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے اور ان کے ملک پر چڑھائی کریں گے۔''(۷۳) مولانا مودودیؒ کفار کی بالادستی ختم ہونے کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ کفار کے سرداروں کے حوصلے اتنے پست ہوئے کہ ان کو راتوں رات میدان سے بھاگنے کی سوجھی اور اپنی ہمت وعزت کو مٹی میں ملاتے ہوئے بھاگ گئے۔ (۷۴) سید کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کفار کو خائب و خاسر کیا اور اپنے رسول ﷺ کو فتح مبین عطا فرمائی۔ اس سے ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ کفار کے غبارے سے ہمیشہ کے لیے ہوا نکل گئی۔ پہلے وہ حملہ آور ہوتے تھے اور مسلمان صرف دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ اب مسلمان آگے بڑھ کے حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہو گئے اور کفار صرف دفاع میں۔ (۷۵) مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس صورت حال نے دشمنوں پر مرعوبیت طاری کر دی اور ابوسفیان نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ کسی طرح اس آفت سے جان بچا کر گھر واپس ہو جائے۔ ان حالات سے اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کے دشمن مرعوب ہوتے چلے گئے۔ (۷۶)

۲) تمام عرب پر اسلام کی بالادستی: جب احزاب کو مدینہ سے نامراد و ناکام واپس لوٹنا پڑا تو اس کا علم تمام عرب کو ہو گیا' کیونکہ اکثر قبائل تو اس لشکر میں شامل تھے اور جو شریک نہیں تھے ان کو بھی علم ہو گیا کہ احزاب کا سردار ابوسفیان کس بزدلی سے میدان جنگ سے بھاگا ہے۔ اس سے تمام عرب میں خوف پیدا ہو گیا اور عرب پر مسلمانوں کی بالادستی چھا گئی۔ پیر کرم شاہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے اس روز اعلان فرمایا:

''آج کے بعد قریش تم پر لشکر کشی نہ کر سکیں گے اب تم ہی ان پر لشکر کشی کرو گے۔''(۷۷)

مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤ چل چکے تھے۔ (۷۸) اس حوالہ سے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ اس وجہ سے اس کے بندوں کو چاہیے کہ اس پر پورا بھروسہ رکھیں۔ اگر وہ اس کے بھروسہ پر اس کی راہ میں اٹھیں گے تو وہ ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا' بلکہ عناصر کائنات سے اور اپنے ملائکہ کو وہ ان کی مدد کے لیے بھیج دے گا۔ (۷۹)

۳) منافقین کی نشاندہی: قرآن مجید نے بھی اس کو اپنا موضوع بنایا ہے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾

''اور جب کہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے' کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو بھی وعدے کیے وہ فریب نکلے۔''

مسعود مفتی لکھتے ہیں کہ منافقین نے اس موقع پر اپنی منافقت کا پردہ خود ہی چاک کر دیا۔ (۸۰) مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بعضے لوگ ان (منافقوں میں سے) نبی ﷺ سے اپنے گھر واپس جانے کی اجازت مانگتے تھے۔ کہتے تھے ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ (۸۱) اس حوالہ سے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ⑬﴾

''اور یاد کرو جب کہتی پھرتی تھی ان میں سے ایک جماعت: اے یثرب والو! تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں (جان عزیز ہے) تو لوٹ چلو (اپنے گھروں کو) اور اجازت مانگنے لگا ان میں سے ایک گروہ نبی کریم ﷺ سے یہ کہہ کر کہ (حضور) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں' حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے۔ اس بہانہ سازی سے ان کا ارادہ محض (میدانِ جنگ سے) فرار تھا۔''

ان تمام شواہد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منافقین کا یہ گروہ جو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں میں منفی پروپیگنڈا کرنے میں پیش پیش تھا' اس غزوہ کے نتیجے میں کھل کر سامنے آ گیا۔

۴) مسلمانوں کی خفیہ ایجنسی کی بنیاد: غزوۂ خندق کے اثرات میں سے ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی خفیہ ایجنسی کی بنیاد رکھی' کیونکہ محاصرہ کی آخری رات نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی ہے جو کفار کا حال مجھے آ کر سنائے؟ پھر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا: تم جاؤ اور کفار کا حال لے آؤ۔ پیر کرم شاہ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ نے ابوسفیان اور اس کے لشکر کے فرار کا آنکھوں دیکھا حال بارگاہ رسالت میں عرض کیا تو رحمت مجسم ﷺ خوشی سے ہنس پڑے' یہاں تک کہ حضور ﷺ کے دندانِ مبارک کی سپیدی ظاہر ہو گئی۔ (۸۲) مفتی محمد شفیع کے مطابق حضرت حذیفہ خفیہ طریقے سے اس لشکر میں گئے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر یوں رسول کریم ﷺ کو سنایا:

''ابوسفیان نے جب یہ اطمینان کر لیا کہ مجمع اپنا ہی ہے' کوئی غیر نہیں' تو اس نے پریشان کن حالات' بنو قریظہ کی بدعہدی اور سامانِ جنگ ختم ہو جانے کے واقعات سنا کر کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اب آپ سب واپس چلیں اور میں بھی واپس جا رہا ہوں۔ اسی وقت لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور سب واپس جانے لگے۔'' (۸۳)

۵) مسلمانوں کی بہترین جنگی حکمت عملی: اس غزوہ میں مسلمانوں کی بہترین حکمت عملی بھی بہت کارگر ثابت ہوئی۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ قبل اس کے کہ یہ جم غفیر آپ ﷺ کے شہر پہنچتا' آپؐ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمال مغربی رخ پر ایک خندق کھدوالی اور کوہ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ (۸۴) مفتی محمد شفیع کے مطابق اہل ایمان کا صبر اور حلم کا جب امتحان مکمل ہوا تو اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کے قریب آ گئی۔ (۸۵) نیز لشکر کفار کی صفوں میں بنو غطفان ایک بہت بڑی طاقت تھی' اس کا ایک سرکردہ آدمی چپکے سے مسلمان ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کفار میں پھوٹ ڈال دی۔ مسلمانوں کی جنگی تدبیر خندق کی وجہ سے اور مسلمانوں کے مدافعتی عمل سے کفار پہلے ہی پریشان تھے۔ چنانچہ یہ حکمت عملیاں کامیاب ہوئیں۔ (۸۶)

۶) یہودیوں کا استیصال: خندق سے پلٹ کر جب حضور ﷺ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریل علیہ السلام نے آ کر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں' بنی قریظہ کا معاملہ باقی ہے' ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضور ﷺ نے فوراً اعلان فرمایا کہ جو کوئی سمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ (۸۷)

مولانا امین احسن اصلاحی اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ محاصرہ تقریباً ۲۵ دن جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے مرعوب ہو کر حضرت سعد بن معاذ کو حکم مان لیا کہ وہ

جو فیصلہ کردیں ان کو منظور ہوگا۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کیا کہ ان کے تمام قابلِ جنگ افراد قتل کردیے جائیں اور بقیہ کو لونڈی اور غلام بنالیا جائے۔ اس فیصلہ کی فوراً تعمیل کی گئی۔''(۸۸)

کفار کے اس استیصال کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾﴾

''اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی' اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار لیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا' ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔''

پیر کرم شاہ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ وہ محاصرے سے تنگ آ گئے اور کہا کہ ہمارے لیے کوئی فیصلہ کردیں تو آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کو حکم مقرر فرمایا۔ حضرت سعد نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ان کے بالغوں کو قتل کردیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کے مال اور جائیداد مہاجرین وانصار میں تقسیم کردی جائیں۔ (۸۹) مفتی محمد شفیع صاحب اس حوالہ سے فرماتے ہیں کہ (جبریل نے کہا) اللہ تعالیٰ کا آپ کو یہ حکم ہے کہ آپ بنوقریظہ پر حملہ کریں اور میں آپ سے آگے وہیں جا رہا ہوں۔ (۹۰)

۷) فتوحات کا آغاز: اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا۔ فتح خیبر ۷ ہجری' فتح مکہ اور غزوۂ طائف ۸ ہجری اور غزوۂ تبوک ۹ ہجری میں ہوئے' جن میں مسلمانوں نے کفار پر چڑھائی کی۔ اور غزوۂ خندق ہی کے دوران رسول اللہ ﷺ نے قیصر وکسریٰ فتح کی خبر دی تھی۔ پیر کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں:

''اسی طرح نبی مکرم ﷺ نے اپنی ضربوں سے نہ صرف اس چٹان کو پارہ پارہ کردیا بلکہ دنیا کی دو بڑی عالمی طاقتوں روم اور ایران کے سنگین قلعوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ اور ان ممالک کی فتح کی نوید بھی اپنے غلاموں کو سنادی۔''(۹۱)

۸) مشاورتی عمل کا ارتقاء: جب جنگ احزاب میں کفار کی چڑھائی کا علم ہوا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے مشورہ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا۔ اس جنگ کی حکمت عملی کے لیے مختلف آراء پیش ہوئیں۔ آخر میں حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سب کو پسند آئی اور اس پر عمل کیا گیا۔ اس کو پیر کرم شاہ صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

''حضرت سلمان (فارسیؓ) نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے ملک فارس میں جب دشمن یوں حملہ کرنے کی نیت سے دھاوا بول دیتا تو ہم اپنے شہر کے اردگرد خندق کھود کر اس کی پیش قدمی کو روک دیتے تھے۔''(۹۲)

رسول اللہ ﷺ کو خبر مل گئی تھی کہ بنوغطفان نے احزاب میں شرکت اس شرط پر کی تھی کہ خیبر کے پھلوں کا آدھا حصہ وہ لیں گے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے بنوغطفان کو یہ پیغام بھجوایا کہ ہم مدینہ کے کھجوروں کا ثلث تمہیں دیں گے اگر تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ محاصرہ چھوڑ کر واپس چلے جاؤ۔ ان کے سردار اس بات پر راضی ہو چکے تھے لیکن آپ ﷺ نے پہلے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا۔ مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حسب عادت ارادہ کیا کہ صحابہ کرامؓ سے اس معاملے میں مشورہ لیں۔ قبیلہ اوس وخزرج کے دو بزرگ سعدَین یعنی سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کو بلا کر ان سے مشورہ لیا۔ (۹۳)

۹) نصرتِ الٰہی پر مسلمانوں کا یقین: جب غزوۂ احزاب کا نتیجہ کفار کی ناکامی اور مسلمانوں کی فتح کی صورت میں

سامنے آیا تو مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا یقین ہوگیا۔اس مضمون کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۝۹﴾

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر، پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہ سکے تھے۔اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے اسے خوب دیکھ رہا تھا۔''

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار پر ہمیشہ کے لیے اسلام کا رعب طاری ہوگیا۔غزوۂ احزاب کے بعد کفار کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں پر پھر حملہ کرتے۔اب مسلمانوں میں یہ طاقت پیدا ہوگئی کہ انہوں نے کفار پر حملے کیے اور اسلام کی ملکی سرحدوں کو وسیع کر دیا۔

خلاصۂ بحث

غزوۂ احزاب سے مندرجہ ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

(۱) غزوۂ احزاب تاریخ اسلامی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس غزوہ کے بعد اسلامی تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔اب تک مسلمان دفاعی نقطہ نظر سے جنگیں لڑتے آئے تھے، لیکن غزوۂ خندق کے بعد مسلمانوں کے حوصلوں میں بہت اضافہ ہوا اور انہیں اقدامی جنگ لڑنے کا موقع فراہم ہوا۔

(۲) غزوۂ احزاب میں احزاب کی اتنی بڑی جمعیت کو شکست و ریخت سے دوچار کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ بھی غزوۂ احزاب کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔آپ ﷺ جانتے تھے کہ اگرچہ کفار و مشرکین یہودیوں اور دیگر قبائل کے گٹھ جوڑ سے اتنی بڑی جمعیت اکٹھی کر کے لے آئے ہیں تاہم اتنی بڑی جمعیت میں نظم و نسق اور باہمی تعاون کا فقدان ہے اور اگر ان کو کچھ عرصہ تک ایک جگہ مایوسی کی حالت میں رہنا پڑا تو لازماً ان میں پھوٹ پڑ جائے گی اور ان کا ٹڈی دل لشکر تتر بتر ہو جائے گا۔بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ آپ ﷺ کی سوچ بالکل درست تھی۔

(۳) غزوۂ احزاب سے قبل مشرکین بلاشرکت غیرے عرب میں اپنی بالادستی قائم کیے ہوئے تھے، لیکن اس جنگ کے نتیجہ میں ان کی یہ بالادستی بڑی حد تک ختم ہو کر رہ گئی۔جب انہوں نے دیکھا کہ اتنی بڑی جمعیت ہونے کے باوجود وہ اسلام کا قلع قمع نہیں کر پائے تو ان میں بددلی پھیل گئی۔اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ صلح حدیبیہ کی شکل میں مشرکین نے اسلام کو قانونی حیثیت میں تسلیم بھی کر لیا اور اسے عرب میں بڑی طاقت کے طور پر پہچانا جانے لگا۔نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہیں کر پائیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے'' حالات کا بالکل درست اندازہ تھا اور آنے والے وقت نے اسے بالکل درست ثابت کر دیا۔

(۴) اس غزوہ کے نتیجہ میں منافقین بھی کھل کر سامنے آ گئے۔غزوۂ اُحد میں بھی اسلام کو ان منافقین کے طرزِ عمل کی وجہ سے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر ان کی

تادیب نہیں فرمائی۔ تاہم اس موقع پر ان کا پردہ چاک ہوگیا اور قرآن نے بڑی صراحت سے ان پر تبصرہ کیا اور ان کے منفی طرزِ عمل کو کھول کر رکھ دیا۔ اس طرح مسلمانوں نے انہیں پہچانا اور آئندہ ان سے بچنے کی تدابیر بھی کیں، جس سے مسلمانوں کو کسی بڑی ہزیمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔

(۵) اس غزوہ میں مسلمانوں کی خفیہ ایجنسی کی بنیاد پڑی اور حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے تن تنہا خفیہ جاسوس کا کردار ادا کیا اور مشرکین کے لشکر میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے اسلام میں خفیہ جاسوسی کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ بعد میں یہ محکمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بہت وسعت اختیار کر گیا اور اس نے اسلامی جنگوں میں بڑا مثبت کردار ادا کیا۔

(۶) غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کی بہترین جنگی حکمت عملی کا بھی پتا چلتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کم تعداد ہونے کے باوجود دشمن کی کثیر تعداد کو اپنی بہترین حکمتِ عملی کی وجہ سے شکست سے دوچار کیا۔ خندق کی کھدائی اور اسی طرح ایک جمِ غفیر کو ایک ماہ تک روکے رکھنا اور پھر اس لشکر کا تتر بتر ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ سب مسلمانوں کی مجموعی کوششوں اور حکمت عملی سے ہی ممکن ہوا۔

(۷) غزوۂ احزاب کے نتیجہ میں یہودیوں کے استیصال کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ بنوقینقاع اور بنونضیر تو اس جنگ سے قبل ہی جلاوطن ہو چکے تھے، لیکن بنوقریظہ بھی اپنی بدعہدی کی وجہ سے رسوا ہوئے اور انہیں بھی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بہت جلد خیبر سے بھی یہود کا اخراج ہوا۔

(۸) غزوۂ احزاب میں خندق کی کھدائی کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم و فارس کی فتح کی بشارت دی تھی۔ اگرچہ غزوۂ احزاب کے معروضی حالات میں یہ بشارت بڑی عجیب محسوس ہوئی اور منافقین نے اس پر منفی پروپیگنڈا کا اظہار بھی کیا، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت بالکل درست تھی اور اس غزوہ کے بعد مسلمانوں کی ناختم ہونے والی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں روم و فارس فتح ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ دراصل مسلمانوں میں فتوحات کی اسپرٹ غزوۂ اَحزاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی اور اسی نے انہیں حوصلہ دیا تھا۔

(۹) غزوۂ احزاب سے ایک اور چیز جو کھل کر سامنے آتی ہے، اور وہ مسلمانوں کا باہمی مشاورتی عمل ہے۔ اگرچہ غزوۂ احد میں بھی مشاورتی عمل ہوا تھا مگر اس موقع پر منافقین نے بڑا منفی رویہ اختیار کیا۔ تاہم غزوۂ احزاب میں خندق کی کھدائی سے لے کر بنوغطفان سے صلح تک کے واقعات میں باہمی مشاورت کا عنصر بڑا گہرا نظر آتا ہے۔ اس مشاورتی عمل نے مسلمانوں کو فتوحات کی راہ پر ڈال دیا اور اسی باہمی مشاورت و تعاون کے نتیجہ میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کے فاتح بن گئے۔

(۱۰) اگرچہ اللہ کی نصرت پر مسلمانوں کو شروع دن سے بھروسہ تھا، لیکن اس غزوہ کے موقع پر منافقین نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے اور ان میں بددلی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر اس غزوہ میں فتح حاصل ہونے کے بعد مسلمانوں میں نصرتِ الٰہی کا اعتقاد پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ اسی بنا پر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے لڑے اور اللہ کے راستے میں جان دینے کے جذبات نے فروغ پایا۔

حوالہ جات

(۱) مصباح اللغات، ص۱۵۰
(۲) نوراللغات، ج۲، ص۱۲۶۳
(۳) فی ظلال القرآن، ج۷، ص۵۲۸
(۴) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۴
(۵) تدبر قرآن، ج۶، ص۱۹۳
(۶) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۷
(۷) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۰
(۸) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۴
(۹) تدبر قرآن، ج۶، ص۱۹۳
(۱۰) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۷
(۱۱) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۰
(۱۲) ایضاً
(۱۳) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۸
(۱۴) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۱۵) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۱
(۱۶) مفتی مسعود، غزوات النبی، ص۳۶
(۱۷) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۸
(۱۸) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۱۹) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۲
(۲۰) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۸
(۲۱) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۲۲) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۲
(۲۳) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۹
(۲۴) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۵
(۲۵) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۰
(۲۶) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۷
(۲۷) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۰۰
(۲۸) ایضاً
(۲۹) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۸
(۳۰) معارف القرآن، ج۷، ص۸۹
(۳۱) ایضاً
(۳۲) تفہیم القرآن، ج۴، ص۷۷
(۳۳) غزوات النبی ﷺ، ص۴۶
(۳۴) تدبر قرآن، ج۶، ص۱۹۳
(۳۵) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۱
(۳۶) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۳۷) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۲
(۳۸) معارف القرآن، ج۷، ص۱۰۸
(۳۹) تفہیم القرآن، ج۴، ص۶۰
(۴۰) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۱۲
(۴۱) غزوات النبی ﷺ، ص۵۸
(۴۲) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۱
(۴۳) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۲
(۴۴) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۰
(۴۵) تفہیم القرآن، ج۴، ص۶۰
(۴۶) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۳
(۴۷) تفہیم القرآن، ج۴، ص۶۱
(۴۸) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۵
(۴۹) تفہیم القرآن، ج۴، ص۲۶
(۵۰) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۲-۱۱۴
(۵۱) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۱۱
(۵۲) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۵
(۵۳) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۵۴) ایضاً
(۵۵) ایضاً
(۵۶) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۰
(۵۷) تدبر قرآن، ج۴، ص۵۵
(۵۸) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۰
(۵۹) غزوات النبی ﷺ، ص۲۴۰
(۶۰) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۵
(۶۱) ایضاً
(۶۲) غزوات النبی ﷺ، ص۲۱
(۶۳) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۶۴) غزوات النبی ﷺ، ص۲۲
(۶۵) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۰۱
(۶۶) معارف القرآن، ج۷، ص۹۵
(۶۷) ضیاء القرآن ج۴، ص۲۷
(۶۸) تدبر قرآن، ج۴، ص۲۰۰
(۶۹) معارف القرآن، ج۷، ص۹۴
(۷۰) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۰۰
(۷۱) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۷
(۷۲) تفہیم القرآن، ج۴، ص۷۸
(۷۳) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۶
(۷۴) تفہیم القرآن، ج۴، ص۶۲
(۷۵) ضیاء القرآن، ج۴، ص۷
(۷۶) تدبر قرآن، ج۶، ص۱۹۹
(۷۷) ضیاء القرآن، ج۴، ص۷
(۷۸) تفہیم القرآن، ج۴ص۶۲
(۷۹) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۱
(۸۰) غزوات النبی ﷺ، ص۵۵
(۸۱) معارف القرآن، ج۷، ص۹۵
(۸۲) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۵
(۸۳) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۶
(۸۴) تفہیم القرآن، ج۴، ص۵۸
(۸۵) ضیاء القرآن، ج۴، ص۲۴
(۸۶) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۴
(۸۷) تفہیم القرآن، ج۴، ص۶۲
(۸۸) تدبر قرآن، ج۶، ص۲۱۲
(۸۹) ضیاء القرآن، ج۴، ص۴۰
(۹۰) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۶
(۹۱) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۹
(۹۲) ضیاء القرآن، ج۴، ص۱۸
(۹۳) معارف القرآن، ج۷، ص۱۱۰

حدیث اور مستشرقین

بسلسلہ : تحریک استشراق: ایک تعارف [۴]

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

حدیث کے بارے میں مغربی اسکالرز کے رویے کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ ابتدائی دورِ تشکیک (early scepticism) کہلاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ دورِ تشکیک کے خلاف ردعمل (reaction against scepticism) کا دور ہے۔ تیسرا مرحلہ درمیانی راہ تلاش کرنے (an attempt to search a middle ground) کا ہے۔ اور چوتھا تشکیک جدید (Neo-scepticism) کا دور ہے۔ [۱]

گولڈ زیہر اور جوزف شاخت کا تعلق پہلے دور سے ہے۔ گولڈ زیہر کا خیال ہے کہ اکثر احادیث پہلی دو صدیوں میں اسلام کی مذہبی، تاریخی اور سماجی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ اس نے اپنی کتاب Muhammedanische Studien کی دوسری جلد میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شاخت کا حدیث کے بارے میں نقطہ نظر گولڈ زیہر سے بھی زیادہ واہیات ہے۔ اس کا کہنا ہے:

"We shall not meet any legal tradition from the prophet which can be considered authentic." [۲]

''فقہی مسائل سے متعلق ہمیں پیغمبرؐ سے کوئی ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی کہ جسے ہم 'صحیح' حدیث قرار دے سکیں۔''

دوسرے دور کے نمایاں اسکالرز میں نابیہ ایبٹ ہے۔ ایبٹ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ گولڈ زیہر اور شاخت کا 'وضعِ حدیث' کا نظریہ غلط ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جو مستشرقین ہجرت کے زمانے کے بعد احادیث کی کثرت کو بنیاد بناتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مدنی زندگی کے دس سالوں میں لاکھوں احادیث کا صادر ہونا ایک ناممکن امر ہے تو ان کو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد کے زمانہ میں کثرتِ احادیث کی وجہ کثرتِ متن نہیں، بلکہ کثرتِ اسناد ہے۔ آگے چل کر ہم اس پر تفصیلی بحث کریں گے۔ [۳] انڈین مسلم اسکالر ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ Studies in Early Hadith Literature میں اسی منہج کو اختیار کرتے ہوئے گولڈ زیہر، شاخت اور مارگولیتھ David Samuel Margoliouth (1858-1940) کے نظریات کا علمی محاکمہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ مقالہ ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ اسی طرح جوزف شاخت کے حدیث کے بارے میں نظریات کا انہوں نے پُرزور رد اپنی کتاب On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence میں کیا ہے۔

تیسرے مرحلے کے نمایاں مستشرقین میں جوئن بال G.H.A. Juynboll اور ہیرلڈ Harald Motzki ہیں۔ جوئن بال اگرچہ شاخت سے متاثر ہے لیکن وہ حدیث کے بارے میں اُس کے انتہائی تشکیک پسندانہ رویے سے متفق نہیں ہے۔ وہ جوزف شاخت کے نقطہ نظر کو کچھ تنقیح کے بعد قبول کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے شاخت کی حدیث کے بارے میں Common Link Theory کو مہذب (refine) کیا ہے۔ شاخت کے نزدیک حدیث کی اسناد دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں وضع (create) کی گئیں تو جوئن بال کے نزدیک حدیث کا مرجع (source) پہلی صدی ہجری کا آخر ہے۔ ہیرلڈ نے پہلی صدی ہجری کی احادیث کی سند کا ماخذ معلوم کرنے کے لیے tradition-historical کا اصول استعمال کیا۔(۴)

چوتھے مرحلہ کے نمایاں لوگوں میں مائیکل کوک Michael Allan Cook (1940) اور نورمن کالڈر Norman Calder کا نام ملتا ہے۔ یہ دونوں گولڈزیہر اور جوزف شاخت سے بھی زیادہ تشکیک پسند ہیں۔(۵)

گولڈزیہر:

گولڈزیہر Ignaz Goldziher (1850-1921) ہنگرین یہودی مستشرق ہے۔ یورپ میں نولڈکے (Noldeke) کی طرح اسے بھی جدید علوم اسلامیہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ نولڈکے جس طرح قرآنیات میں مستشرقین کا امام ہے تو بالکل اسی طرح گولڈزیہر کو علوم حدیث میں مستشرقین کی پیشوائی کا مقام حاصل ہے۔ گولڈزیہر ہی وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حدیث پر باقاعدہ نقد کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر جامع' منظّم اور محقق انداز میں پیش کیا۔

گولڈزیہر سے پہلے گستاف وائل Gustav Weil (1808-1889) کا نام ہمیں ملتا ہے کہ جس نے اپنی کتاب Geschichte der Chaliphen میں یہ رائے پیش کی کہ صحیح بخاری کی تمام روایات کو رد کر دینا چاہیے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد الائے اسپرنگر Aloys Sprenger (1813-1893) نے اپنی کتاب Das Leben und die Lehre des Mohammad میں یہ بات کہی کہ ذخیرہ احادیث کی ایک بڑی تعداد 'موضوع' (fabricated) کی نسبت 'صحیح' احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء کے مابین شائع ہوئی۔ بعد ازاں ولیم میور William Muir (1819-1905) نے اپنی کتاب The Life of Mahomet میں حدیث کی صحت وضعف معلوم کرنے کے لیے اپنا ایک ذاتی معیار متعارف کروایا۔ اس کے نزدیک احادیث کی حیثیت ایک تاریخی ریکارڈ (historical facts) کی سی ہے۔ علاوہ ازیں گولڈزیہر سے پہلے ڈوزی Reinhart Dozy (1820-1883) نے اپنی کتاب Het Islamisme میں یہ رائے پیش کی کہ صحیح بخاری کی نصف روایات 'صحیح' ہیں۔(۶) یہ وہ مستشرقین تھے کہ جنہوں نے گولڈزیہر سے پہلے حدیث کے بارے میں اپنی کسی رائے کا اظہار کیا۔

گولڈزیہر نے اپنی تعلیم Budapest' Leipzig' Berlin اور Leiden کی یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ ۱۸۷۳ء میں اسے ہنگری حکومت نے شام' فلسطین اور مصر کے دورہ پر بھیجا تا کہ وہ مسلمان علماء سے استفادہ کر

سکے۔اس نے جامعہ ازہر کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔مصر میں قیام کے دوران وہ اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس کے بقول وہ دل سے مسلمان ہو گیا تھا اگرچہ زبان سے اس نے اسلام کا اقرار نہیں کیا تھا۔(۷) اس نے جمعہ کی ایک نماز میں شرکت کے دوران اپنے سجدے کی کیفیت کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے ایسی ایمانی حلاوت پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔(۸)

گولڈزیہر نے ایک کتاب Muhammedanische Studien (Muslim Studies) کے نام سے مرتب کی جو دو جلدوں میں ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی جس میں اس نے حدیث کے بارے میں اپنا 'وضع حدیث' (Fabrication of Hadith) کا نقطہ نظر پیش کیا۔

گولڈزیہر کا خیال ہے کہ اکثر احادیث پہلی دو صدیوں میں اسلام کی مذہبی' تاریخی اور سماجی ترقی کا نتیجہ ہیں۔(۹) اس کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ نے بالعموم اور معاویہ بن ابی سفیان' مغیرہ بن شعبہ' عبداللہ بن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے بالخصوص احادیث گھڑی ہیں۔مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے شکار اور جانوروں کی رکھوالی کے علاوہ کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ بتلایا گیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی یہی روایت اللہ کے رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں لیکن وہ شکار اور رکھوالی کے علاوہ کھیتی کے کتے کو بھی استثناء میں شامل کرتے ہیں تو اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک کھیتی کے مالک ہیں۔اس سے گولڈزیہر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کیا کہ چونکہ وہ ایک کھیت کے مالک ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی روایت میں اپنے ذاتی فائدے کی خاطر کھیتی کے استثناء کو بھی شامل کر لیا۔اس طرح گولڈزیہر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اپنے ذاتی مسائل یا مفادات کی خاطر احادیث گھڑنے کا عمل صحابہ رضی اللہ عنہم ہی سے شروع ہو گیا تھا۔(۱۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے جس قول کو بنیاد بناتے ہوئے گولڈزیہر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر احادیث وضع کرنے کا الزام لگایا' اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

"عن عمرو بن دينار عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ أمر بقتل الكلاب' إلا كلب صيد' أو كلب غنم' أو ماشية' فقيل لابن عمر: إن أبا هريرة يقول: أو كلب زرع' فقال ابن عمر: إن لأبي هريرة زرعا۔" (صحيح مسلم' كتاب المساقاة' باب الأمر بقتل الكلاب وبيان نسخه)

''حضرت عمرو بن دینار' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا سوائے شکار یا مویشیوں کی رکھوالی کے کتوں کے۔عبداللہ بن عمر سے کہا گیا کہ ابو ہریرہ یہ کہتے ہیں کہ کھیتی کا کتا بھی مستثنیٰ ہے تو انہوں نے جواب دیا: ابو ہریرہ کے پاس کھیت ہے۔''

امر واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنے کا وعدہ کیا لیکن نہ آئے اور انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ آپؐ کے حجرہ مبارک میں کتے کا ایک بچہ تھا جس کی وجہ سے وہ نہ آسکے۔روایت کے الفاظ ہیں:

”عن ابن عباس قال: حدثتنی میمونة زوج النبی ﷺ أن النبی ﷺ قال: إن جبریل علیہ السلام کان وعدنی أن یلقانی اللیلة فلم یلقنی ثم وقع فی نفسه جرو کلب تحت بساط لنا فأمر به فأخرج ثم أخذ بیده ماء فنضح به مکانه فلما لقیه جبریل علیہ السلام قال: إنا لا ندخل بیتا فیه کلب ولاصورة۔ فأصبح النبی ﷺ فأمر بقتل الکلاب۔“ (سنن أبی داؤد‘ کتاب اللباس‘ باب فی الصور)

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی زوجہ محترمہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ایک دن مجھ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رات میں ملاقات کا وعدہ کیا لیکن ملاقات کے لیے تشریف نہ لائے۔ پھر آپ ﷺ کے دل میں کتے کے ایک بچے کا خیال آیا جو بستر کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ پس آپ ﷺ نے اسے حجرہ مبارک سے باہر نکالنے کا حکم دیا‘ پس اسے نکال دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کی جگہ پانی چھڑک دیا۔ پس جب جبرائیل علیہ السلام نے اللہ کے رسول ﷺ سے ملاقات کی تو انہوں نے کہا: ہم فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے کہ جس میں کتا یا تصویر ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس پر صبح ہوتے ہی کتوں کے قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا۔“

کتوں کی موجودگی چونکہ فرشتوں کی آمد میں مانع تھی لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے عمومی قتل کا حکم جاری فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

”عن نافع عن ابن عمر قال: أمر رسول اللہ ﷺ بقتل الکلاب‘ فأرسل فی أقطار المدینة أن تقتل۔“ (صحیح مسلم‘ کتاب المساقاة‘ باب الأمر بقتل الکلاب وبیان نسخه)

”حضرت نافع‘ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ مدینہ کے گردونواح میں لوگوں کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا۔“

اس قتل کے حکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بقول دو قسم کے کتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

”عن ابن عمر أن رسول اللہ ﷺ أمر بقتل الکلاب‘ إلا کلب صید‘ أو کلب غنم‘ أو ماشیة۔“ (صحیح مسلم‘ کتاب المساقاة‘ باب الأمر بقتل الکلاب وبیان نسخه)

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا سوائے شکار یا مویشیوں کی رکھوالی کے کتوں کے۔“

جب بڑی تعداد میں کتوں کو قتل کیا جا چکا تو پھر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے قتل سے منع کر دیا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

”عن جابر قال: أمر النبی ﷺ بقتل الکلاب‘ حتی کانت المرأة تقدم من البادیة یعنی بالکلب فنقتله‘ ثم نهانا عن قتلها‘ وقال: علیکم بالأسود۔“ (سنن أبی داؤد‘ کتاب الصید‘ باب فی اتخاذ الکلب للصید وغیره)

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کے قتل کا حکم دیا‘ یہاں تک کہ ایک

عورت دیہات سے مدینہ میں اپنے کتے کے ساتھ آتی تھی تو ہم اس کتے کو بھی قتل کر دیتے تھے۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے سیاہ کتے کے علاوہ کتوں کو قتل کرنے سے ہمیں منع کر دیا۔''

ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں' لہٰذا میرا مقصود ان کی نسل کا خاتمہ نہیں ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں کتوں کا پالنا ایک معمول اور رواج ہو وہاں اللہ کے رسول ﷺ کے قتل کے اس حکم میں بظاہر یہ حکمت بھی نظر آتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس جانور کی محبت کی بجائے اس سے کراہت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ جب یہ مقصود کسی درجے میں حاصل ہو گیا تو پھر ایک دن آپ ﷺ نے مزید کتوں کے قتل سے منع کرنے کے لیے ایک خطبہ دیا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عن عبد اللّٰه بن مغفل قال: إني لممن يرفع أغصان الشجرة عن وجه رسول اللّٰه ﷺ وهو يخطب' فقال: ((لولا أن الكلاب أمة من الأمم لأمرتُ بقتلها كلها' فاقتلوا منها كل أسود بهيم' وما من أهل بيت يرتبطون كلبا إلا نقص من عملهم كل يوم قيراط' إلا كلب صيد' أو كلب حرث' أو كلب غنم)) (سنن الترمذی' أبواب الأحكام والفوائد' باب ما جاء من أمسك كلبا ما ينقص من أجر)

''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے چہرے سے درخت کی شاخیں ہٹانے کے لیے انہیں پکڑا ہوا تھا جبکہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کتے اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق نہ ہوتے تو میں ان سب کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔ پس اب ان میں سے جو کالے سیاہ ہیں تو انہیں قتل کرو۔ اور کوئی بھی گھر والے کسی کتے کو باندھ کر رکھیں گے تو ان کے اجر وثواب میں سے روزانہ ایک قیراط کم ہو جائے گا سوائے شکار' کھیتی یا مویشیوں کے کتے کے۔''

اس روایت سے یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ یہ ایک دوسرے موقع پر علیحدہ سے حکم تھا۔ پہلا حکم کتوں کے قتل کا تھا اور اس میں شکار اور مویشی کا استثناء رکھا گیا۔ بعد میں کتوں کے قتل کا حکم ختم کر دیا گیا اور ایک دوسرا حکم جاری کیا گیا کہ کتا پالنا اجر وثواب میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ اس حکم میں شکار اور مویشی کے ساتھ کھیتی کا استثناء بھی رکھا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت پہلے حکم کے استثناء کے بارے میں ہے' جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت دوسرے حکم کے مستثنیٰ کو بیان کر رہی ہے' لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح یہی استثناء حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خود بھی ایک دوسرے مقام پر کر رہے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عن قتادة عن أبي الحكم' قال: سمعت ابن عمر' يحدث عن النبي ﷺ قال: ((من اتخذ كلبا' إلا كلب زرع' أو غنم' أو صيد' ينقص من أجره كل يوم قيراط)) (صحيح مسلم' كتاب المساقاة' باب الأمر بقتل الكلاب وبيان نسخه)

''حضرت قتادہ نے ابوالحکم سے نقل کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی کتے کو رکھا سوائے کھیتی یا بھیڑ

بکریوں یا شکار کی غرض سے تو اس کے اجر میں سے ایک قیراط روزانہ کم کیا جائے گا۔''

پھر یہ بھی ہے کہ کھیتی کے کتے کا استثناء صرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا ہے بلکہ اور بھی صحابہ نے کیا ہے' جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عن سفیان بن أبی زهیر قال: سمعتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ((من اقتنی کلبا' لا یغنی عنه زرعا ولا ضرعا' نقص من عمله کل یوم قیراط)) فقیل له: أنت سمعتَ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال: إی' ورَبِّ هٰذا المسجد۔'' (سنن ابن ماجة' کتاب الصید' باب النهی عن اقتناء الکلب إلا کلب صید أو حرث أو ماشیة)

''سفیان بن ابی زہیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے کوئی کتا پالا جو اس کی کھیتی یا مویشیوں کے کام کا نہ ہو تو اس کے عمل میں سے روزانہ ایک قیراط اجر کم کیا جائے گا''۔ سفیان بن ابی زہیر سے کہا گیا کہ واقعتاً آپ نے یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں! اس مسجد کے رب کی قسم!''

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

''عن عبد اللّٰه بن مغفل أن رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم: أمر بقتل الکلاب' ثم قال: مالهم وللکلاب؟ ثم رخص لهم فی کلب الزرع۔'' (سنن ابن ماجة' کتاب الصید' باب قتل الکلاب إلا کلب صید أو زرع)

''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو مارنے کا حکم دیا اور کہا: یہ کتے ان کے کس کام کے ہیں؟ پھر آپ نے کھیتی کے کتے کے بارے میں رخصت دے دی۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے اس تبصرے کا ہرگز وہ مطلب نہیں ہے جو گولڈ زیہر نکال رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے کہنے کا مطلب صرف یہی ہے کہ ابو ہریرۃ کھیت والے ہیں لہٰذا انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کو یاد رکھا کہ کھیتی کا کتا بھی استثناء میں شامل ہے۔ ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ تبصرہ **''یرحم اللّٰه أبا هریرة کان صاحب زرع''** (صحیح مسلم' کتاب المساقاة' باب الأمر بقتل الکلاب وبیان نسخه) کے الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ اگر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصود اس تبصرے سے یہ ہوتا کہ ابو ہریرہؓ نے یہ استثناء اپنے مفاد کے لیے گھڑ لیا ہے تو وہ ابو ہریرہ کے لیے دعائیہ کلمات کیوں کہتے؟ ان الفاظ کا معنی ومفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ابو ہریرۃ پر رحم فرمائے! وہ کھیتی والے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کھیتی کے استثناء کو یاد رکھا۔ یہ تو ابو ہریرہؓ پر الزام کی بجائے ان کے حق میں تعریفی کلمات ہیں جنہیں گولڈ زیہر نے کمال فن سے اعتراض بنانے کی کوشش کی ہے۔

گولڈ زیہر کا خیال یہ بھی ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور ان کے گورنر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے سرکاری سرپرستی میں احادیث گھڑنے کا رواج اس وقت عام ہوا جب انہوں نے اپنے منبر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح وثناء کی سرکاری مہم چلائی۔ (۱۱)

گولڈزیہر کے بقول بنوامیہ کے دور میں احادیث گھڑنے کے عمل میں اضافہ ہوا اور یہ کام علماء نے کیا۔ اس کے بقول معاشرے نے جب حکمرانوں کے ظلم وستم کو دیکھا تو علماء نے ان ظالم حکمرانوں کے خلاف احادیث وضع کیں' مثلاً وہ روایات جوان کے خلاف خروج یا ان سے جہاد کو بیان کرتی ہیں۔ (۱۲) اس کے برعکس حکمران بھی بھولے یا بے وقوف نہیں تھے۔ انہوں نے حکمرانوں کے خلاف خروج کے رد میں احادیث وضع کیں۔ اس طرح ایک سیاسی عمل احادیث کے ایک ذخیرہ کے وضع کرنے کا سبب بنا۔ (۱۳)

جوزف شاخت:

جوزف شاخت Josef Schacht (1902-1969) ایک جرمن/برطانوی مستشرق ہے۔ وہ ایک کیتھولک فیملی میں پیدا ہوا اور جرمنی میں ہی اس نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے اساتذہ میں Gotthelf Bergsträsser کا نام ملتا ہے۔ وہ آکسفورڈ' لائیڈن اور کولمبیا یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کا پروفیسر رہا ہے۔ اہل مغرب میں حدیث اور فقہ اسلامی میں تخصص کی وجہ سے معروف ہے۔ حدیث کے بارے میں اس نے اپنا نقطہ نظر اپنی کتاب محمدی فقہ کے مصادر (Origins of Muhammadan Jurisprudence) میں پیش کیا جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں فقہ اسلامی کے بارے میں اس کی کتاب فقہ اسلامی کا تعارف (An Introduction to Islamic Law) شائع ہوئی۔ حدیث میں اس نے Common Link Theory کا تصور پیش کیا۔

شاخت حدیث کے بارے میں اپنے پیش رَو گولڈزیہر کے افکار سے متاثر ہے۔ اس نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ اس کی کتاب کا اصل مقصود گولڈزیہر کے نقطہ نظر کو تقویت دینا اور قانونی (فقہی) احادیث کا ماخذ امام شافعی کے زمانے کے بعد ثابت کرنا ہے۔ (۱۴) شاخت کا خیال ہے کہ محمد ﷺ کے قانون کا آغاز بنوامیہ کے آخری دور میں ہوا۔ (۱۵) احادیث کی کتب میں فقہی مسائل سے متعلقہ جو روایات ہمیں ملتی ہیں وہ امام مالک اور امام شافعی کے زمانے کے بعد گھڑی گئیں۔ (۱۶) وہ قانونی احادیث کے گھڑے جانے کی تاریخ متعین کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ۱۵۰ تا ۲۵۰ھ کے مابین کا زمانہ ہے (۱۷) اگرچہ اس وضع کی ابتدا اس کے بقول پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں ہو چکی تھی۔ (۱۸)

شاخت کے نزدیک فقہ اسلامی کی تدوین کے زمانہ میں مختلف مکاتب فکر نے اپنے مسالک کی تائید کے لیے اہم شخصیات کے نام سے احادیث گھڑ لیں۔ (۱۹) احادیث کے وضع کیے جانے کے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں مثال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمان علماء کے ہاں مالك عن نافع عن عبد الله بن عمر ایک ایسی سند ہے جسے بہت زیادہ مستند سند (Golden Chain) شمار کیا جاتا ہے۔ اِس حد تک تو اُس کی بات درست ہے کہ محدثین نے اس سند کو 'سلسلة الذهب' کا نام دیا ہے کہ اس میں امام مالک' امام نافع سے روایت کر رہے ہیں جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ امام مالک' حدیث کی کتاب مؤطا امام مالک کے مصنف' اور صحابیٔ رسول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے مابین صرف ایک واسطہ ہے اور وہ واسطہ بھی ایک جلیل القدر تابعی اور عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہما کے مولیٰ کا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ امام نافع کی وفات تقریباً ۱۱۷ھ میں ہوئی جبکہ امام مالک کی ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ امام نافع کی وفات کے وقت امام مالک ایک لڑکے تھے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب مؤطا میں نافع سے بیان کردہ روایات اتنی چھوٹی عمر میں ان سے لکھی ہوں۔(۲۰) اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ امام مالک کی سن پیدائش کے بارے کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے۔(۲۱)

شاخت اس سند پر جو نقد کر رہا ہے وہ انتہائی سطحی ہے۔اس کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ امام مالک کی سن پیدائش کے بارے میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔ امام مالک کی سن پیدائش کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح روایت کے مطابق یہ ۹۳ھ ہے' جیسا کہ امام ذہبی (۲۲) اور امام زرکلی (۲۳) وغیرہ نے لکھا ہے۔اس اعتبار سے امام نافع کی وفات کے وقت امام مالک کی عمر تقریباً ۲۴ سال بنتی ہے اور دونوں ایک ہی شہر مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ اگر امام مالک نے ۲۰ سال کی عمر میں بھی ان کی شاگردی اختیار کی ہو تو انہیں چار سال ان کی صحبت نصیب ہوئی۔

امام مالک نے اپنی کتاب مؤطا میں امام نافع سے ۸۰ روایات نقل کی ہیں جو ابن عبد البر کے شائع شدہ صفحات کے مطابق تقریباً ۱۵ صفحات بنتے ہیں۔(۲۴) امام مالک اور امام نافع جب دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے ہیں' تو ایک شاگرد کو اپنے ایک استاذ سے ۸۰ روایات لینے میں کتنا وقت درکار ہوگا؟ اگر امام مالک نے روزانہ ایک روایت اوسطاً امام نافع سے سیکھی ہو تو یہ ۸۰ دن بمشکل تین ماہ بنتے ہیں۔

امام مالک کی سن پیدائش کے بارے میں بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ ۹۰ھ ہے یا بعض نے ۹۴ھ کا بھی ذکر کیا ہے۔بعض کے نزدیک یہ ۹۶ھ میں ہے جبکہ ایک قول ۹۷ھ کا بھی ہے۔لیکن کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے جس میں ۹۷ھ کے بعد میں ان کی پیدائش نقل کی گئی ہو۔ پس اگر اس اختلاف میں اصح قول کے بجائے آخری قول کو بھی لیا جائے تو اس کے مطابق بھی امام نافع کی وفات کے وقت امام مالک کی عمر تقریباً ۲۰ سال بنتی ہے(۲۵) اور اگر انہیں تین ماہ کے لیے بھی امام نافع کی شاگردی حاصل ہوئی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ ۸۰ روایات ان سے نقل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عجیل جاسم النشمی نے اپنی کتاب 'المستشرقون ومصادر التشريع الإسلامي' میں گولڈ زیہر اور جوزف شاخت کے وضع حدیث کے نقطہ نظر پر مفصل نقد کیا ہے جبکہ ڈاکٹر سعد المرصفی نے بھی اپنی کتاب 'المُستشرقون والسُّنّة' میں ان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

نابیہ ایبٹ:

نابیہ ایبٹ Nabia Abbott (1897-1981) ایک امریکن مستشرق ہے جو یونیورسٹی آف شکاگو میں مشرقی علوم کی پہلی پروفیسر تھیں۔ وہ ۱۸۹۷ء میں ترکی میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد ایک تاجر تھے لہٰذا وہ اپنے والد کے ساتھ کچھ عرصہ عراق اور پھر انڈیا میں رہیں جہاں انہوں نے لکھنو سے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مسلمان خواتین کی تاریخ پر ان کا کافی کام موجود ہے۔ سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر ان کی کتاب

"Aishah, the Beloved of Muhammad" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ان کے نمایاں تحقیقی کاموں میں تین جلدوں میں ان کی کتاب "Studies in Arabic Literary Papyri" ہے جو ۱۹۵۷ء، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں۔

ایبٹ نے گولڈزیہر اور شاخت کے اس نقطہ نظر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ احادیث کے ایک معتد بہ ذخیرہ کی اسناد نظریہ ضرورت کے تحت وضع کی گئی ہیں۔ (۲۶) ایبٹ کا کہنا یہ ہے کہ میں نے احادیث کے جن مخطوطات (manuscripts) پر ریسرچ کی ہے، اس کے مطابق احادیث زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے نسل در نسل نقل ہوتی چلی آئی ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئیں، غلط ہے۔ ایبٹ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ غلط فہمی احادیث کی اسناد کے میکانزم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایبٹ کے بقول احادیث کے متون (texts) تو اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے نسل در نسل چلے آ رہے تھے لیکن بعد کے زمانوں میں ان متون کو نقل کرنے والوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے مختلف طبقات میں اسناد (chains of transmitters) کی کثرت پیدا ہوگئی۔ (۲۷)

ایبٹ کی یہ بات درست ہے کہ نقل روایت میں متون کی اتنی کثرت نہیں ہے جتنی کہ اسناد کی ہے۔ محدثین کے نزدیک ایک ہی متن جب دس اسناد سے منقول ہو تو وہ اسے دس احادیث شمار کرتے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری کی روایات کی تعداد ۷۲۷۵ ہے۔ (۲۸) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے صحیح بخاری کا انتخاب کیا ہے۔ (۲۹) مستشرقین مثلاً ڈنکن مکڈونلڈ (1863-1943) وغیرہ نے اسی بات کو طعن بنا لیا ہے کہ امام بخاری کو چھ لاکھ میں سے ساڑھے سات ہزار احادیث ہی صحیح مل سکیں، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ احادیث لاکھوں کی تعداد میں وضع کی گئی تھیں۔ (۳۰) جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ لاکھوں روایات لاکھوں متون نہیں تھے بلکہ لاکھوں اسناد تھیں جو ہزاروں متون کو نقل کر رہی تھیں، جیسا کہ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بیان کیا۔ (۳۱)

جیمز روبسن:

گولڈزیہر اور جوزف شاخت کے بعد ہمیں مغرب میں حدیث کا کوئی بڑا ناقد نظر نہیں آتا۔ اگرچہ الفریڈ Alfred Guillaume (1888 – 1966) نے ایک کتاب The Traditions of Islam: An Introduction to the Study of the Hadith Literature کے نام سے لکھی لیکن مصطفیٰ الاعظمی کے بقول وہ گولڈزیہر کے افکار کا ہی چربہ ہے، کوئی نئی تحقیق نہیں ہے۔ (۳۲) روبسن James Robson (1890) جس نے مشکوٰۃ شریف کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے، کی بھی حدیث پر کئی ایک تحریریں ملتی ہیں، لیکن وہ بھی بنیادی طور شاخت ہی سے متاثر ہے۔

روبسن نے احادیث کی سند کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عروہ بن زبیر (متوفی ۹۴ھ) تک حدیث کی سند موجود نہیں تھی اور احادیث بغیر سند کے نقل ہو رہی تھیں اور زہری (متوفی ۱۲۴ھ) کے زمانے میں اسناد کا رواج عام ہوا۔ (۳۳) روبسن کا کہنا یہ بھی ہے کہ معروف مؤرخ اور سیرت نگار ابن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ)

نے دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں اکثر معلومات بغیر سند یا ناقص سند کے ساتھ بیان کی ہیں۔ (۳۴)

ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کے بقول تو روبسن بات کی حقیقت کو سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ (۳۵) اور یہ بات درست معلوم ہوتی ہے' کیونکہ روبسن تاریخ اور حدیث میں فرق بھی نہیں کر سکا۔ وہ حدیث پر نقد کرتے ہوئے یہ دلیل بیان کرنے لگ جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثر تاریخ بغیر سند کے نقل ہوئی ہے۔ سیرت بھی تاریخ اسلام کا ہی ایک باب ہے اور تاریخ مصادرِ اسلام میں سے نہیں ہے' جبکہ سنت وحدیث مآخذ اسلام میں سے ہیں۔ سنت اور سیرت کی کتابیں ہمیشہ سے مختلف رہی ہیں۔ سیرت کے بنیادی مصادر سیرت ابن اسحاق یا سیرت ابن ہشام کو کبھی بھی مآخذ شریعت کے طور پر نقل نہیں کیا گیا' جبکہ صحاحِ ستّہ جو سنت وحدیث کی کتب ہیں' کو قانونِ اسلامی میں ایک مصدر کی حیثیت حاصل ہے۔ سیرت کا مقصود اللہ کے رسول ﷺ کے حالاتِ زندگی کا جامع مطالعہ ہے جبکہ سنت وحدیث میں اصل مقصود شریعت اسلامیہ کی حفاظت ہے۔ یونیورسٹی آف برمنگھم سے جیمز روبسن اور جان برٹن کے نظریہ حدیث پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ ۲۰۱۱ء میں ہوا ہے جس میں ان دونوں کے نقطہ نظر کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ (۳۶) علاوہ ازیں ڈاکٹر حاکم عبیسان المطیری نے بھی اپنی کتاب 'تاريخ تدوين السنة وشبهات المستشرقين' میں روبسن کے نقطہ نظر پر نقد کی ہے۔

ڈاکٹر لقمان سلفی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ 'اهتمام المحدثين بنقد الحديث سندا ومتنا ودحض مزاعم المستشرقين وأتباعهم' میں نمایاں مستشرقین کے علاوہ مسلمانوں میں ان کے افکار سے متاثر مصری اور ہندی اسکالرز مثلاً احمد امین' ابو ریہ' احمد زکی ابو شادی' اسماعیل ادھم' سرسید احمد خان اور چراغ علی وغیرہ کے نظریات کا بھی علمی محاکمہ کیا ہے۔ مستشرقین کے باطل افکار میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ائمہ محدثین نے حدیث کی سند کی چھان پھٹک تو کی ہے لیکن حدیث کے متن کی تحقیق نہیں کی جس کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے عام طور پر اردو میں 'درایت' کا لفظ استعمال ہوتا ہے کہ حدیث کی روایتاً تحقیق تو ہوگئی ہے اب درایتاً ریسرچ کی ضرورت ہے۔ اس مقالہ میں یہ بات بطور موضوع شامل ہے کہ محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک روایت اور درایت یعنی سند ومتن دونوں پہلوؤں سے کی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء العمری کا مقالہ 'موقف الاستشراق من السنة والسيرة النبوية' بھی حدیث اور مستشرقین کے موضوع پر ایک اہم تحریر ہے۔ انہوں نے لیون کیتانی Leone Caetani (1869-1935)' ولیم میور William Muir (1819-1905) اور اسپرنگر کے نظریات کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

مصادر ومراجع:

1- Minggu, The Study of Hadith Literature in the West, Accessed on 10 October 2013, http://berandaintelektual.blogspot.com/2013/04/the-study-of-hadith-literarture-in-west.html.

2- Joseph Schacht, Origins of Muhammadan Jurisprudence, Oxford University Press, London, 1967, p. 149.

3- Minggu, The Study of Hadith Literature in the West.

4- Ibid.

5- Ibid.

6- Fatma Kizil,The Views of Orientalists on the Hadith Literature, Accessed on 10 October 2013, http://www.lastprophet.info/the-views-of-orientalists-on-the-hadith-literature.

7- "In those weeks, I truly entered into the spirit of Islam to such an extent that ultimately I became inwardly convinced that I myself was a Muslim, and judiciously discovered that this was the only religion which, even in its doctrinal and official formulation, can satisfy philosophic minds. My ideal was to elevate Judaism to a similar rational level. Islam, as my experience taught me, is the only religion, in which superstitious and heathen ingredients are not frowned upon by rationalism, but by orthodox doctrine." (Hamid Dabashi, Post Orientalism: Knowledge and Power in Time of Terror, Transaction Publishers, New Jersey, 2009, p. 88.)

8- "In the midst of the thousands of the pious, I rubbed my forehead against the floor of the mosque. Never in my life was I more devout, more truly devout, than on that exalted Friday." (Ibid., p. 49.)

9- 'The Prophet,' it says in a tradition in al-Bukhari, gave the oder to kill all dogs except hunting and sheep dogs. Umar's son was told that Abu Hurayra also hands down the words: 'but with the exception of farm dogs as well.' Umar's sons says to this: Abu Hurayra owns cornfield, i.e. he has a vested interest in handing down the order with the addition that farm dogs should be spared as well. This remark of Ibn Umar is characteristic of the doubt about the good faith of the transmitters that existed even in the earliest period of the formation of tradition. (Talal Maloush, Early Hadith Literature and the Theory of Ignaz Goldziher, University of Edinburgh, 2000, p. 195)

10- And after his [Prophet PBUH] death they added many salutary sayings which were thought to be in accord with his sentiments and could therefore, in their view, legitimately be ascribed to him, or of whose soundness they were in general convinced. These ahadiths dealt with the religious and legal practices which had been developed under the Prophet and were regarded as setting the norm for the whole Islamic world. They formed the basic material of hadith. (Ibid., p. 166)

11- Official influence on the invention, dissemination and suppression of traditions started very early. An intruction given to his obedient governor al-Mughirah by Muawiyah-I is in the spirit of Ummayyads: Do not tire of abusing and insulting Ali and calling for God's mercifulness for Uthman. (Talal Maloush, Early Hadith Literature and the Theory of Ignaz

Goldziher, University of Edinburgh, 2000, p. 176)

12- Thus the hadith led in the first century a troubled existence, in silent opposition to the ruling element which worked in the opposite direction. The pious cultivated and disseminated in their orders the little that they had saved from early times or acquired by communication. They also fabricated new material for which they could expect recognition only in a small community. (Ibid., p. 168)

13- This must not lead us to believe that during this period theologians were alone at work on the tradition. The ruling power itself was not idle. If it wished an opinion to be generally recognized and the opposition of pious circles silenced, it too had to know how to discover a hadith to suit its purpose. They had to do what their opponents did: invent, or have invented, hadiths in their turn. And that is in effect what they did. (Ibid., p. 169)

14- The importance of a critical study of legal traditios for our research into the origins of Muhammadan jurisprudence is therefore obvious. This book will be found to confirm Goldziher's results, and tog o beyond them in the following respects: a agreat many tradition in the classical and other collections were put into circulation only after Shafi'i's time. (Joseph Schacht, The Origins of Muhammadan Jurisprudence, Oxford University Press, London, 1967, p. 4)

15- In any case, it is safe to say that Muhammadan legal science started in the later part of the Umaiyad period, taking the legal practice of the time as its raw material and endorsing, modifying, or rejecting it. (p. 190.)

16- The aim of Part II is to show that a considerable number of legal traditions, which appear in the classical collections, originated after Malik and Shafi'i. (Ibid., p. 138)

17- The aim of the present chapter is to provide a firm starting point for the systematic use of traditions as documents for the development of legal doctrine, by investigating the growth of legal traditions in the literary period, roughly from A.H. 150 to 250, between Abu Hanifa and the classical collections of traditions, with a few extensions into the first half of the second century. (Ibid., p. 140)

18- Without attempting a rash generalization, we are therefore justified in looking to the first half of the second century A.H. for the origin of the bulk of legal traditions with which the literary period starts. (Ibid., p. 176)

19- In particular, we shall see in the following chapter that some of those isnads which the Muhammadan scholars esteem most highly are the result of widespread fabrication in the generation preceding [Imam] Malik. The

isnads were often put together very carelessly. Any typical representative of the group whose doctrine was to be projected back on to an ancient authority, could be chosen at random and put into the isnad. (Ibid., p. 163)

20- But as Nafi' died in A.H. 117 or thereabout, and Malik in A.H. 179, their association can have taken place, even at the most generous estimate, only when Malik was little more than a boy. It may even be questioned whether Malik, whom Shafi'i charged elsewhere with concealing imperfections in his isnads, did not take over in written form traditions alleged to come from Nafi'. (Ibid., p. 176-77)

21- Nothing authentic is known of Malik's date of birth. (Ibid., p. 176)

۲۲۔ الذهبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان، سیر أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، بیروت، ۱۹۸۵ء، ۴۹/۸۔

۲۳۔ الزرکلی، خیر الدین بن محمود بن محمد، دار العلم للملایین، بیروت، ۲۰۰۲ء، ۲۵۷/۵۔

24- Mustafa al-Azami, On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence, Suhail Academy, Lahore, 2004, p. 171)

25- Ibid.

26- The isnads were often put together very carelessly. Any typical representative of the group whose doctrine was to be projected back on to an ancient aithority, could be chosen at random and put into isnad. (Origins of Muhammadan Jurisprudence, p. 163)

27- Analysis of the content and the chains of transmission of the traditions of the documents and of their available parallels in the standard collections, supplemented by the results of an extensive study of the sources on the sciences of Tradition, ulum al-hadith, lead me to conclude that oral and written transmission went hand in hand almost from the start, that the tradition of Muhammad as transmitted by his Companions and their Successors were, as a rule, scrupulously scrutinized at each step of the transmission, and that the so-called phenomenal growth of Tradition in the second and third centuries of Islam was not primarily growth of content, so far as the hadith of Muhammad and the hadith of the Companions are concerned, but represents largely the progressive increase of parallel and multiple chains of transmission. (Nabia Abbott, Studies in Arabic Literary Papyri, The University of Chicago Press, Chicago, 1967, vol. 2, p. 2)

۲۸۔ محمود الطحان، تیسیر مصطلح الحدیث، مرکز المدنی للدراسات، الإسکندریة، ۱۴۱۵ھ، ص۳۴)

۲۹۔ ابن بطال، علی بن خلف بن عبد الملك، شرح صحیح البخاری،مکتبة الرشد، الریاض، ج۱، ص۶)

30- Duncan B. Macdonald, Development of Muslim Theology, Jurisprudence and Constitutional Theory,The LawBook Exchande,New Jersey,2008,p.80.

۳۱۔ الجوزی، جمال الدین عبد الرحمن بن علی بن محمد، صید الخاطر، دار القلم، دمشق، ۲۰۰٤ء، ص ۲۵۸۔

۳۲۔ محمد بهاء الدین الدکتور، المستشرقون والحدیث النبوی، دار النفائس، الأردن، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۔

۳۳۔ أیضاً: ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

۳٤۔ أیضاً: ص ۱۰۱۔

۳۵۔ أیضاً: ص ۲۱۔

36- Abstract: The present thesis is a critical examination of the two well-known post-Schachtian scholars of Hadith; James Robson and John Burton. Both scholars are major contributors to modern Hadith studies in the West. It assesses their main arguments and their methodological approaches to Hadith literature. It also provides a historical survey of the key arguments and works of their predecessors since the rise of the modern Western debates over the reliability of Hadith materials. This critical study points to the conclusion that Robson and Burton were heavily influenced by the sceptical attitude of Ignaz Goldziher and Joseph Schacht towards the historicity of Hadith. However, Robson is inclined to accept some aspects of the Muslim traditional view regarding the genesis of Hadith and its isnad system (chain of transmitters). Burton, on the other hand, expresses a sceptical stance towards the historicity of Hadith and argues that the development of Hadith originated from the exegesis of the Qur'an, having no historical basis in the teachings of Prophet Muhammad.
(Alshehri, Mohammed S.H, A critical study of western views on Hadith with special reference to the views of James Robson and John Burton, Ph.D. thesis, University of Birmingham, 2011, Accessed on 10 October 2013, http://etheses.bham.ac.uk/1671/.

تعمیرِ خودی[1]

مدثر رشید

قدیم زمانے کی بات ہے کہ بہت سی بھیڑ بکریاں کسی چراگاہ میں رہتی تھیں۔ ایک دن چند شیر کسی جنگل سے یہاں آ نکلے اور انہوں نے بھیڑوں پر حملہ کر دیا' اور دیکھتے ہی دیکھتے چراگاہ بھیڑوں کے خون سے سرخ ہوگئی۔ اس دوران کہ شیر بھیڑوں کی چیر پھاڑ میں مصروف تھے' ان میں سے ایک دانا' سمجھ دار اور ادھیڑ عمر بھیڑ نے شیروں کو مخاطب کر کے وعظ شروع کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ دیکھو میں خدا کی طرف سے خاص روحانی قوت سے مالا مال ہوں۔ میں تمہیں یہ نصیحت کرتی ہوں کہ اپنے برے کاموں سے توبہ کرو' جو بھی غصیلہ اور طاقت کے نشے میں چور ہے وہ بد بخت ہے۔ دانتوں کی تیزی تمہیں رسوا کر رہی ہے۔ شان و شوکت اور ہیبت اور دبدبے کی خواہش تو نرا فساد ہے۔ تم جو بھیڑ بکری کو مار کر فخر کرتے ہو' اگر بلندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو مارو! جو گوشت کھانا چھوڑ دے وہ خدا کا مقبول بن جاتا ہے اور نیک روحیں گھاس پات کھا کر ہی گزارا کرتی ہیں۔ شیر جو پہلے ہی لگاتار جدوجہد اور محنت اور مشقت سے تھک چکے تھے' ان کو جدوجہد سے بے گانہ کر دینے والی یہ نصیحت پسند آ گئی۔ چنانچہ انہوں نے جو کبھی بھیڑوں کا شکار کیا کرتے تھے خود بھیڑوں کی سی خصلت اپنا لی۔ بس پھر کیا تھا' رفتہ رفتہ شیروں کو' جو گوشت کے عادی تھے' گھاس مزہ دینے لگی۔ پھر کافی عرصہ گھاس کھانے کی وجہ سے دانتوں کی وہ پہلی سی کاٹ بھی جاتی رہی۔ شعلہ بکھیرنے والی آنکھوں کی وہ پہلی سی ہیبت بھی نہ رہی۔ دل سے جرأت اور دلیری بھی آہستہ آہستہ رخصت ہوگئی۔ فولادی مضبوط پنجوں میں کمزوری آ گئی اور جسموں کی قوت و طاقت بھی گھٹ گئی۔ جان کا خوف بڑھ گیا اور اس کے نتیجے میں ہمت اور دلیری بھی ختم ہوگئی۔ غرضیکہ شیر اب دیکھنے میں تو شیر تھے لیکن حقیقتاً وہ بھیڑ بن چکے تھے۔ یا دوسرے معنوں میں وہ اب اپنی اصل سے غافل ہو چکے تھے۔ یہ قصہ علامہ اقبال نے اپنی مشہور مثنوی 'اسرارِ خودی' میں بیان کیا ہے' جو ان کے تصورِ خودی کی ایسی سادہ اور آسان تشریحات سے بھری پڑی ہے۔ علامہ کے نزدیک ہر چیز کی ایک اصل ہے' جب تک وہ اس پر قائم رہتی ہے اس کا وجود برقرار رہتا ہے اور جیسے ہی وہ اس سے غافل ہوتی ہے اپنا وجود بھی کھو دیتی ہے۔ گویا وجود درحقیقت اسی جوہرِ خودی کی نمود ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا!
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا!

اس حقیقتِ خودی کو انہوں نے مثنویِ اسرارِ خودی میں مختلف انداز میں واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کوہ چوں از خود رود' صحرا شود　　شکوہ سنجِ جوشش دریا شود

[پہاڑ جب اپنی ذات یا خودی سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ بکھر کر صحرا کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور سمندر کے طوفان کی شکایت کرنے لگتا ہے۔]

موج تا موج است در آغوشِ بحر　　می کند خود را سوارِ دوشِ بحر

[موج جب تک آغوشِ بحر میں موج کی صورت ہے سمندر کے اندر ہے (یعنی وہ اپنی خودی سے باخبر ہے) وہ اپنے آپ کو سمندر کے کندھوں پر سوار رکھتی ہے۔]

خودی کی یہ شاید سب سے آسان تشریح ہے جو علامہ نے اس مثنوی میں خود بیان کی ہے۔ گو پہاڑ ہو یا موج، دریا ہو یا سمندر، غرضیکہ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ہر کسی کی ایک اصل، ایک خودی ہے، اور اس کی بقاء کا دارومدار اس خودی کے استحکام پر ہی ہے، ورنہ فنا اس کا مقدر ہے۔ اب یہیں سے ایک اور سادہ سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کی وہ اصل کیا ہے جس پر اس کا وجود منحصر ہے؟ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسرارِ خودی کو آشکارا کرنے کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی اصل کیا ہے، اس پر تو شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جس میں وقت کے اہلِ علم و بصیرت نے غور کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں مشرق و مغرب کے ہر دور کے لٹریچر میں مل جاتا ہے۔ لیکن جو چیز اقبال کے تصورِ خودی کو ان دیگر تصورات سے ممیّز کرتی ہے وہ ان کا انسانِ مطلوب یعنی مردِ مؤمن کا تصور ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رامائن و مہا بھارت اور اسلامی تصوف کا 'مردِ کامل'، کارلائل کا 'ہیرو'، شوپن ہائر کا 'جینئس'، نیٹشے کا 'فوق البشر' (Superman)، گوئٹے کا تصورِ انسان (جو ایکرمین (Eckermann) کے توسط سے سامنے آتا ہے) اور ان جیسے دیگر تصوراتِ انسانی خودی کی ہی دیگر تشریحات ہیں۔ جب ہم انسان کی ہمہ گیر شخصیت اور اس کی بے پناہ صلاحیتوں، جن کی حامل کائنات کی کوئی اور مخلوق نہیں، کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس امر کا اندازہ بھی بآسانی ہو جاتا ہے کہ انسان کی حقیقت یا اس کی خودی کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ بنی نوع انسان نے آج تک جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ سب اس خودی کی صلاحیتوں کی نمود ہے، اور جن جن نے یہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ انسانِ مطلوب قرار پائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اٹیلا، چنگیز، نپولین، ہٹلر وغیرہ کی شخصیات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان میں نیٹشے کا فوق البشر دکھائی دیتا ہے، جب ہم ارسطو، افلاطون، آئن سٹائن، نیوٹن وغیرہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں شوپن ہائر کا جینئس دکھائی دیتا ہے اور جب ہم عبدالقادر جیلانی، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، مولانا روم وغیرہم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں انسانِ کامل نظر آتا ہے۔ غرضیکہ ہر کسی نے ایسے رجالِ عظام میں سے کسی کو اپنا مطلوب سمجھا اور اسی پر اپنے نظریۂ خودی کو استوار کر دیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے جس ہستی کو انسانِ مطلوب قرار دیا اس کی جھلک انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین کی شخصیات میں ملتی ہے اور جس کا کامل اور اکمل مجسمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے جو دراصل تمام اوصافِ حسنہ کے جامع ہیں۔ وہ ایسے فاتح اور حاکم تھے جنہوں نے ایک عظیم حکومت اور تہذیب کی بنیاد ڈالی، ان کا مجموعۂ حدیث علم و حکمت کے موتیوں سے بھرا پڑا ہے اور ان کی خدا خوفی، للّٰہیت، اور انسان دوستی کا کوئی ثانی پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتا۔ یہ ان صفات کی جامعیت ہی تھی کہ جس بنا پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

عظمت کا اعتراف غیر مسلم بھی کرنے پر مجبور ہیں۔

اقبال کے انسانِ مطلوب کی اس جامعیت ہی کا مظہر تھا کہ ان کا فلسفہ خودی ایک جامع فلسفے کے طور پر تشکیل پایا اور جیسا کہ شروع میں بیان ہوا یہی وہ کلیدی نکتہ تھا جو قرآن میں تدبر سے ان پر منکشف ہوا۔ اصل میں یہ وہ حقیقت ہے جس تک انسان اپنی عقل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے وہ ایک خاص قسم کے علم یعنی علمِ وحی کا محتاج ہے' جو اس کائنات کے خالق اور رب نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچایا۔ علامہ اقبال خود مسلمان تھے اور قرآن وحی کی کامل صورت میں ان کے پاس موجود تھا۔ پھر ان کا اس سے والہانہ لگاؤ اور اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی روحانی بصیرت وہ سب عوامل تھے جنہوں نے ان کے لیے اس بنیادی مسئلہ کا حل آسان بنا دیا۔ چنانچہ شارحینِ اقبال اس پر متفق ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک انسان کی اصل یعنی خودی بندۂ مؤمن ہے' جس کی معراج محمد عربی ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال سے پہلے شیخ احمد سرہندی' مولانا روم اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم مسلمان مجددین کرام نے بھی اس حقیقت کو سمجھا' لیکن علامہ اقبال کو کیونکہ ایسا دور ملا تھا جب مغرب میں احیاء العلوم کی تحریک زور وشور سے جاری تھی اور کائنات' خدا اور انسان کے بارے میں نت نئے تصورات اور فلسفے وجود میں آ رہے تھے اور قدیم پیچیدہ مسائل ٹھوس علمی حقائق کی روشنی میں حل ہوتے جا رہے تھے' ان کو اپنے اس صحیح اسلامی تصور کو جس کا ماخذ وحی الٰہی تھا اس دور کی اعلیٰ علمی سطح پر ٹھوس عقلی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر شاعری کے خوبصورت اور دلکش اندازِ بیان نے اس کو وسیع حلقے میں متعارف کرانے میں بے حد مدد دی۔ چنانچہ اقبال کا تصورِ خودی کوئی نیا تصور نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں پہلے سے موجود تصورات کی اسلامی نکتہ نگاہ سے ایک مفصل اور مدلل تشریح ہے۔ لیکن ایک بات جوان کے کلام سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے وہ یہ کہ ان کے اصل مآخذ جن سے انہوں نے اپنے افکار اخذ کیے' قرآن وسنت تھے نہ کہ مغربی فلاسفہ کے افکار ونظریات' جن کو پیش کرنے سے ان کا مقصد وقت کے اعلیٰ علمی ذہن تک اپنا پیغام پہنچانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کلام میں وہ کہیں بھی ان مغربی حکماء سے متاثر نظر نہیں آتے جیسا کہ بعض معترضین الزام لگاتے ہیں' بلکہ اس کے برعکس وہ ان کے نظریات کے غلط پہلوؤں پر تنقید کرتے ہی نظر آتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا　　زُنّاریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی　　ہے اس کا طلسم سب خیالی!
انجامِ خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری!

ایک اور جگہ نیٹشے کے بارے میں فرماتے ہیں:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں　　تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!

یہاں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب تحریر کے آغاز میں خودی کی سادہ اور آسان تشریح کی بات کی گئی تھی تو اس سے مراد تصورِ خودی کی تشریح تھی نہ کہ فلسفہ خودی کی۔ فلسفہ خودی دراصل وہ جامع فلسفہ ہے جس کی بنیادیں علامہ اقبال نے اپنے تصورِ خودی پر استوار کیں۔ فلسفہ خودی کو سمجھنا یقیناً اتنا آسان نہیں اور نہ ہی اس کی

کوئی آسان تشریح ہوسکتی ہے۔اس فلسفے کا بنیادی تصور کیونکہ اللہ ربّ العزت کے عطا کردہ علم وحی پر ہونے کی وجہ سے صحیح ہے‘اس کی تشکیل بھی صحیح طرز پر ہوسکتی ہے‘ جو اسے ان تمام فلسفوں پر فوقیت دے سکتی ہے جو تمام تر علمی و عقلی حقائق سے مرصّع ہونے کے باوجود غلط تصورات پر استوار ہونے کی وجہ سے غلط قرار پائے جا چکے ہیں یا پائے جا رہے ہیں۔شارحینِ اقبال کے نزدیک یہ واحد فلسفہ ہے جو کائنات‘ خدا اور انسان کو ایک مربوط انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات فلسفۂ انسان و کائنات‘ فلسفۂ سیاست‘ فلسفۂ قانون‘ فلسفۂ تعلیم‘ فلسفۂ اخلاق‘ فلسفۂ اقتصادیات‘ فلسفۂ تاریخ‘ فلسفۂ ہنر‘ فلسفۂ نفسیات وغیرہم سب پر کسی نہ کسی صورت میں پڑتے ہیں۔ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم‘ جو اقبال کے ایک مستند شارح ہیں‘ اپنی کتاب ’حکمتِ اقبال‘ کے دیباچے میں تصورِ خودی اور فلسفۂ خودی کے درمیان اس فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

’’عرصۂ دراز تک اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبال کے تصورات علمی اور عقلی اعتبار سے نہایت برجستہ‘ زوردار‘ درست اور ناقابل تردید ہیں اور اگرچہ یہ تصورات اس کی نظم اور نثر کی کتابوں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں تاہم ان میں ایک عقلی اور ایک علمی ربط موجود ہے۔اور اس کی جہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب صرف ایک تصور سے ماخوذ ہیں جسے اقبال خودی کا تصور کہتا ہے۔لہٰذا اقبال کی تشریح کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ خودی کے مرکزی تصور کے ساتھ اس کے دوسرے تمام تصورات کے علمی اور عقلی ربط کو واضح کیا جائے۔اور اگر ایسا کرنے کے بغیر اس کی کوئی تشریح کی جائے گی تو وہ مسلمانوں کے لیے بالعموم اور غیر مسلموں کے لیے بالخصوص پوری طرح سے قابل فہم اور تسلی بخش نہیں ہو سکے گی۔دراصل اس وقت بھی اقبال کے خیالات کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ اقبال کے خیالات کی علمی اور عقلی ترتیب اور تنظیم مہیا نہیں کی گئی۔دوسرے الفاظ میں میرا نتیجہ یہ تھا کہ اقبال کا فلسفہ دنیا کے اور بڑے بڑے فلسفوں کی طرح بالقُوّہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل اور مسلسل فلسفہ ہے جس کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورات میں ایک عقلی یا منطقی ترتیب موجود ہوتی ہے جو اسے مؤثر اور یقین افروز بناتی ہے۔اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے تصورات کی مخفی عقلی ترتیب اور تنظیم کو آشکار کر کے اس کے فکر کو ایک مکمل نظامِ حکمت (Philosophical System) کی شکل دی جائی تا کہ وہ نہ صرف پاکستان کے اندر پوری طرح قابل فہم بن جائے بلکہ دنیا کے آخری باطل شکن عالمگیر فلسفے کی حیثیت سے دنیا کے علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔‘‘

جہاں تک فلسفہ خودی کی بات ہے تو وہ آگے چل کر اس کو ’’مستقبل کا فلسفہ‘‘ اور یہاں تک کہ ’’کائنات کا آخری فلسفہ‘‘ قرار دیتے ہیں:

’’حکمتِ اقبال کی یہی وہ خصوصیات ہیں جو اسے کائنات کا وہ آخری فلسفہ بنا دیتی ہیں جو ہر دور کے باطل فلسفوں کا مسکت اور تسلی بخش جواب ہو۔شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی کے زمانہ میں اس قسم کے فلسفہ کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔آج اگر مسلمان یا کوئی اور قوم جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کا معقول علمی جواب دینا چاہے‘ جسے دورِ حاضر کا انسان بھی سمجھ سکے‘ تو وہ صرف اقبال کے نظامِ حکمت سے

ہی پیدا کیا جاسکتا ہے' کسی اور فلسفہ سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ انسان اور کائنات کی سچی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جس قسم کی ذہنی رکاوٹیں کسی زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں قدرت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے علاج بھی ویسا ہی کرتی ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی اپنے مزاج کے لحاظ سے اپنے دور کے فلسفوں کی تمام ظاہری خصوصیات سے حصہ لیتا ہے تاکہ ان کا تسلی بخش جواب بن سکے۔''(۱)

چنانچہ فلسفہ خودی پر انہوں نے ایک شہرۂ آفاق تصنیف 'آئیڈیالوجی آف دی فیوچر' لکھی جس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ لیکن اس پر تو ابھی بہت کام کرنا باقی ہے اور ابھی تک جو کام بھی ہوا ہے اس کی حیثیت ابتدائی نوعیت کی ہے۔ بہرحال اس تحریر کا مقصد فلسفہ خودی کو تفصیلاً پیش کرنا نہیں ہے' جس پر ان شاء اللہ پھر کبھی بات ہوگی' بلکہ اس کا مقصد تصورِ خودی کے اس پہلو کو واضح کرنا ہے جو عملی بھی ہے اور انقلابی بھی' جسے اقبال تعمیرِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لیے علامہ نے تربیتِ خودی' استحکامِ خودی اور تشکیلِ خودی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ وہ انقلابی تصور ہے جس کا مقصد ان شیروں کو پھر سے اپنی خودی حاصل کرنے کا طریق بتانا ہے جو بھیڑ کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر اسے کھو بیٹھے ہیں۔ علامہ کے نزدیک یقین' عمل پیہم' عشق' فقر' خودداری' حق گوئی و بے باکی وغیرہ وہ صفات ہیں جن کو اپنانے سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے جس کے ذریعے انسان اپنی خودی کی تربیت کرسکتا ہے علامہ نے مربوط شکل میں صرف چند مقامات پر ہی بیان کیا ہے۔ جیسا کہ 'اسرارِ خودی' میں ایک مقام پر علامہ تربیتِ خودی کے تین مراحل بیان کرتے ہیں: اطاعت' ضبطِ نفس اور پھر نیابت الٰہی۔ لیکن اگر ان کے کُل کلام پر غور کیا جائے تو اس سلوک کو انہوں نے بہت وضاحت سے پیش کیا ہے جس میں ان مراحل کے علاوہ اور مراحل کا ذکر بھی ملتا ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ مربوط شکل میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بیان ہوئی یہی ہے کہ علامہ نے اپنے افکار کا اظہار شاعری کے ذریعے سے کیا ہے' جس میں ربط قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا' کیونکہ ایسا کرنے سے شاعری کا حسن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم شعراء کے شارحین ہوتے ہیں جو ان کے افکار کو ایک نظم اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم ان شارحین میں وہی شاعر کے تصورات کو واضح کر پاتے ہیں جو اس کے طبیعی میلانات اور ماخذات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ورنہ ایسا ہوتا ہے کہ شارحین شعراء کے کلام میں موجود اجمال سے فائدہ اٹھا کر تشریح کی آڑ میں اپنے نظریات پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریر کا مقصد غیر جانبدار ہو کر علامہ اقبال کے کلام کی روشنی میں تعمیرِ خودی کے سلوک کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنا ہے تاکہ اس انقلابی تصور کے ذریعے موجودہ دور کے لیے عملی راہنمائی حاصل کی جاسکے۔

تعمیرِ خودی کے اس سلوک کے ضمن میں علامہ نے صرف مراحل ہی بیان نہیں کیے بلکہ ان ذرائع کی نشاندہی بھی کی ہے جن کے ذریعے انسان ان مراحل کو عبور کرسکتا ہے اور یہی ان کے کلام کا امتیاز ہے۔ یقین' عمل پیہم' عشق' فقر' خودداری' حق گوئی و بے باکی وغیرہ جن صفات کو اپنانے کی تلقین اقبال کرتے ہیں' یہ تو ہمیشہ سے معلوم ہیں۔ لیکن ان صفات کو کیسے اپنایا جاسکتا ہے' اس پر شاید اس تفصیل سے بات کسی کے ہاں نہیں ملتی۔

۱۔ سلوکِ تعمیرِ خودی

ذیل میں تفصیلاً سلوکِ تعمیرِ خودی کے دیگر مراحل بیان کیے جا رہے ہیں:

پہلا مرحلہ: مقصد کا تعین: علامہ اقبال کے نزدیک وہ شخص جس کا مقصد صرف ضروریاتِ زندگی کا حصول، نفس پرستی اور شہوت رانی ہی ہے تو ایسا شخص اپنی خودی کی تعمیر نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی حیثیت جانور سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا مقصد بھی نفس پرستی اور شہوت رانی ہے۔

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود؟ گر بخود محکم نہ بودن چہ سود؟

[حیوانوں کی مانند محض کھانے اور آرام کر لینے کا کیا فائدہ؟ اور اگر تو اپنے آپ میں توانا نہیں تو زندگی کا کیا فائدہ؟]

جو شخص اپنی ذات سے بلند ہو کر کسی اعلیٰ مقصد کو پانے کی کوشش کرتا ہے تو یہیں سے اس کی خودی کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے نزدیک سلوکِ تعمیرِ خودی کا سب سے پہلا مرحلہ ایک بلند مقصد کا تعین ہے۔ یہ دراصل انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ کوئی بھی کام سرانجام دینا چاہتا ہے تو پہلے اس کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اگر اس کام کی تکمیل اس کا مقصد نہ ہو تو وہ کبھی بھی اس کے لیے عمل پیرا نہیں ہو پاتا۔ علامہ کا انسانِ مطلوب چونکہ قرآن کا بندۂ مؤمن ہے، چنانچہ وہ مقصد کا تعین بھی قرآن کی روشنی میں ہی کرتے ہیں۔ خود اسلامی لٹریچر میں جہاں کہیں انسانِ مطلوب حضور ﷺ کو ہی سمجھا گیا ہے وہاں بھی مقصد کے صحیح تعین میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ یہی ہے کہ انسان کی اس حقیقت تک رسائی علم وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس مقصد کے صحیح تعین میں سب سے بڑی رکاوٹ خود انسان کی اپنی ماہیت ہے۔ آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق انسان روح و بدن کا مرکب ہے۔ لیکن مغرب نے چونکہ بدترین پاپائیت (Theocracy) سے چھٹکارا حاصل کیا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک طویل عرصے تک دورِ جاہلیت میں رہے، چنانچہ مغرب میں اس کے ردعمل میں جو تحریک احیاء العلوم شروع ہوئی، اس میں دین سے بیزاری کا عنصر غالب تھا۔ چنانچہ اس کے بعد جو بھی نظریات اور فلسفے سامنے آئے، ان میں انسان کے بدن کو ہی اصل اہمیت حاصل رہی، جبکہ روح، جو مذہبی تعلیمات کا اصل محور ہے، کو سراسر فراموش کر دیا گیا۔ چنانچہ نیٹشے جس کا تصورِ فوق البشر اقبال کے تصورِ مردِ مؤمن کے کافی قریب تر ہے، روح کا ہی نہیں، خدا کا بھی انکاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فوق البشر ایک ایسی سفاک ہستی ہے جو کسی اخلاقیات کا پابند نہیں ہے، وہ حق و باطل طے کرنے میں خود مختار ہے اور کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف طاقت حاصل کرنا ہے اور اس راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو بزورِ طاقت ہٹا دینا ہے۔

اس کے برعکس ہم جب روایتی اسلامی تصوف کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ترکِ دنیا کا سبق ملتا ہے جہاں زیادہ اہمیت انسان کی روح کی ہے اور بدن کو یا دنیا کو کافی حد تک فراموش کر دیا گیا ہے۔ (۲) یہی وجہ ہے کہ روایتی تصوف کا بلند ترین مقام فنا فی اللہ ہے جہاں سالک دنیا سے بیزار ہو کر اللہ کی یاد میں خلوت گزیں ہو جاتا ہے۔ اور پھر سلوک کی ان منازل کو طے کرنے کے بعد اس کا مقصد اب دوسروں کو بھی اسی سلوک پر چلا کر اس منزل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ دونوں انتہائیں انسان کی ماہیت کو کُلّی طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ علامہ اقبال نے اس کے برعکس اس حقیقت کو واضح کیا کہ انسان روح و بدن کا مجموعہ ہے، اس کو کسی صورت بھی علیحدہ کر کے نہیں

دیکھا جاسکتا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ مانویت کے زیر اثر قبول کرلیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے' وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کی قائل نہیں۔ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات' روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ زمانی و مکانی میں ہوتا ہے۔''(۳)

پھر اسی ضمن میں یہ فرماتے ہیں:

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں وجودِ حضرتِ انساں' نہ روح ہے' نہ بدن!

اس سے یہ براہِ راست نتیجہ نکلتا ہے کہ اب تعمیر خودی کے لیے جو بھی مقصد متعین ہونا چاہیے وہ بیک وقت دُنیوی بھی ہونا چاہیے اور اُخروی بھی۔ تبھی انسان کی صحیح نہج پر تربیت ہوسکتی ہے اور وہ اپنا اصل مقام پاسکتا ہے۔ چنانچہ اقبال 'اسرارِ خودی' میں اس مقصد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پرزور انداز میں اس کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز از شرابِ مقصدے مستانہ خیز!

[اے کہ جو رازِ زندگی سے بے خبر ہے' ہمت سے اٹھ' اور کسی مقصد کی شراب سے مستانہ ہو کر اٹھ!]

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ ماسویٰ را آتشِ سوزندۂ

[ایسا مقصد جو نورِ سحر کی مانند روشن ہو اور غیر اللہ کو آگ کی طرح جلا کر راکھ کر دے۔]

مقصدے از آسماں بالا ترے دل ربائے ' دلستانے ' دلبرے

[ایسا مقصد جو آسمان سے بھی بلند تر ہو' وہ دلربا بھی ہو' دلستاں بھی اور دلکش بھی۔]

باطلِ دیرینہ را غارت گرے فتنہ در جیبے ، سراپا محشرے

[وہ مقصد جو پرانے نظام باطل کو برباد کرنے والا ہو' اس کی جیب میں فتنے ہوں اور وہ خود سراپا محشر ہو۔]

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

[ہم تو صرف تخلیقِ مقاصد ہی سے زندہ ہیں اور ہمیشہ آرزو کی شعاع ہی سے روشن ہیں۔]

اس مقصد کی خصوصیات اور پھر علامہ کا انسانِ مطلوب کو رسول اللہ ﷺ کی ذات میں دیکھنا اور ان کا قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ' ان سب حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو علامہ کی نظر میں یہ مقصد اللہ کی رضا کی خاطر 'اقامت دین'، اظہارِ دین' یا 'اعلائے کلمۃ اللہ' کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال نے اس مقصد کو بالخصوص اس نام سے تفصیلاً پیش نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کسی تصور کو عرفِ عام میں پیش کیا جاتا ہے تو اس میں کبھی بھی اس تصور کو پیش کرنے والا مخصوص اصطلاحات استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے' کیونکہ ایسا کرنے سے اس تصور کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو اس کے طبیعی میلانات کو جانتا ہے وہ اس کے تصور میں ان کی جھلک ضرور دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال 'اسرارِ خودی' میں ایک ایسا مقام ضرور ہے جس کے عنوان میں علامہ نے اس مقصد کا صریحاً ذکر کیا ہے۔ یہ عنوان اور اس نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

در بیاں ایں کہ مقصدِحیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللّٰہ است و جہاد اگر محرّکِ اُو جوع الارض باشد در مذہبِ اسلام حرام است

[اس موضوع کے بارے میں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۃ اللہ کا بلند کرنا ہے اور ایسا جہاد جس کا محرک تسخیر ممالک ہو اسلام کی رو سے حرام ہے۔]

صلح شر گردَد چو مقصود است غیر　　گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

[اگر خدا کے سوا کچھ اور مقصد ہوگا تو صلح بھی جو بظاہر نیک کام ہے سراسر برائی بن جائے گی اور اگر غرض حق ہو تو جنگ میں بھی جو بظاہر برا کام ہے بلاشبہ خیر کا پہلو ہوتا ہے۔]

گر نہ گردَد حق زِتیغ ما بلند　　جنگ باشد قوم را نا ارجمند

[اگر ہماری تلوار سے کلمہ حق سربلند نہ ہو تو اس قسم کی جنگ ملت کے لیے بے کار اور بے وقعت ہوگی۔]

پھر علامہ کے بے شمار اشعار ہیں جن سے اس نتیجے کی تائید ہوتی ہے:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے　　نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری　　کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار　　لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

ان اشعار اور اسی طرح اقبال کے سارے کلام پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ کے نزدیک وہ بلندترین مقصد جس پر انسان کی خودی کی تعمیر ہوسکتی ہے، اعلائے کلمۃ اللہ ہی ہے۔ اقبال کے ماخذ یعنی قرآن سے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ سورۃ الصّف کی مندرجہ ذیل آیت میں تو اللہ ربّ العزت خود اپنے رسول ﷺ کی زندگی کا مقصد متعین فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۹﴾ (الصف)

''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت دے کر اور سچا دین دے کر تاکہ اسے غالب کر دے کُل دین پر چاہے مشرکوں کو کتنا ہی برا لگے۔''

گویا کہ اظہارِ دین ایسا مقصد اور نصب العین ہے جو تعمیرِ خودی کے سلوک کو واضح کرنے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے مقرر کیا۔ یقیناً حضور ﷺ کو اس تعمیر کی ضرورت نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان کی سیرت کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے اُسوہ بنانا تھا لہٰذا ان کو بھی تعمیر خودی کے اس سلوک پر چلنا پڑا۔ عقلی اور منطقی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو اس سے بلند تر مقصد کوئی نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ بیک وقت مادی اور روحانی دونوں اعتبارات سے اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ مادی و دُنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بلند مقصد طاقت اور حکومت کا حصول ہی مانا جاتا ہے، کیونکہ باقی تمام مقاصد اسی کے تابع ہیں۔ شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کے بعد بھی انسان میں طاقت کے حصول کی طلب باقی رہتی ہے۔ ہاں اگر طاقت حاصل ہو جائے تو پھر ایسا شخص اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس روحانی لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بلند

مقصد دنیا سے بے نیازی ہے' جسے عام طور پر فقر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس نے بھی اس طرف کچھ پیش رفت کی وہ عظیم آدمی کہلایا۔ اب اگر ان دونوں مقاصد کو ملا دیا جائے تو مقصد کچھ اس طرح طے پائے گا کہ طاقت حاصل کرنا اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ اس سے بھی بلند تر مقصد کے لیے' اور یہ اقامت دین ہی ہوسکتا ہے جس کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی سربلندی کے لیے طاقت حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ اور اقبال کے نزدیک یہی سچا فقر ہے کہ دنیا کی سب سے محبوب ترین شے یعنی طاقت موجود ہو (یا اس کے لیے کوشش ہو) اور پھر بھی اس سے بے نیاز رہا جائے (یا رہنے کا عزم ہو)۔ کسی کے پاس دُنیوی لحاظ سے بلند ترین مرتبہ نہ ہو تو اس کے بغیر اس کا دعوائے فقر ایک جھوٹا دعویٰ ہی گردانا جائے گا۔ علامہ کا تصورِ فقر اس روایتی تصورِ فقر سے کس قدر مختلف ہے' اسے انہوں نے یوں بیان فرمایا ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری ! اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی' سرمایۂ شبیری!

بہرحال جس قسم کا مقصد چنا جائے گا تعمیر بھی اسی نہج پر ہوگی۔ اگر نیٹشے کے مطابق مقصد صرف طاقت حاصل کرنا ہے تو پھر ہٹلر' نپولین' سکندر جیسی شخصیات ہی تشکیل پائیں گی اور اگر مقصد صرف دنیا سے بے نیاز ہوکر یادِ باری تعالیٰ میں محو ہو جانا ہے تو پھر روایتی صوفیاء جیسی ہستیاں ہی تشکیل پائیں گی۔ جبکہ اقبال کا انسانِ مطلوب یعنی انسان کی اصل یا خودی بندۂ مؤمن ہے اور جس کی معراج حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ یہ 'حلقہ یاراں' ہو تو ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے لیکن 'رزمِ حق و باطل' ہو تو فولاد بن جاتا ہے' اس کے دل میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ 'جہانگیر'، 'جہاں دار'، 'جہاں بان' اور 'جہاں آرا' ہوتا ہے۔ اور یہ انسانِ مطلوب جس مقصد کے لیے جدوجہد کے نتیجے میں تشکیل پا سکتا ہے وہ مقصد آپ ﷺ کے مقصد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا جو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقرر فرمایا۔

دوسرا مرحلہ: آرزو: مقصد کے تعین کے بعد تعمیرِ خودی میں اقبال کے نزدیک دوسرا مرحلہ آرزو کا ہے۔ یعنی اس مقصد کو پا لینے کی آرزو۔ جس مقصد کو پا لینے کی آرزو ہی دل میں نہ ہو تو اس کے حصول کے لیے کوشش کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ 'اسرارِ خودی' کے مندرجہ ذیل اشعار میں اقبال مقصد' آرزو اور جستجو کے باہم تعلق کو یوں بیان کرتے ہیں:

زندگانی را بقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست
[زندگی کی بقاء کسی نہ کسی مدعا سے ہے' اور اس قافلے کے لیے بانگ جرس مدعا ہی ہے۔]
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
[مستقل قوتِ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی بنیاد آرزو پر رکھی گئی ہے۔]
آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نہ گردَد مشت خاکِ تو مزار
[تو آرزو کو اپنے دل میں زندہ اور بیدار رکھ' تاکہ تیری مُشت خاک مزار نہ بن جائے۔]

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

[جہانِ رنگ و بو کی روح آرزو ہے اور ہر چیز کی فطرت آرزو کی امانت دار ہے۔]

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

[سینوں میں دل تمنا ہی سے رقص کرتے ہیں اور تمنا کی روشنی سے سینے مثل آئینہ مجلی ہیں۔]

طاقتِ پرواز بخشد خاک را خضر باشد موسیٰ ادراک را

[آرزو خاک کو بھی طاقت پرواز عطا کرتی ہے اور وہ کلیم عقل کے لیے مانند خضر رہنمائی کرتی ہے۔]

دل زِ سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات

[دل سوزِ آرزو ہی سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ جب آرزو دل میں زندہ ہوتی ہے تو غیر اللہ فنا ہو جاتا ہے۔]

چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند شہپرش بشکست و از پرواز ماند

[جب دل تخلیقِ مقاصد سے محروم ہو جائے، تو سمجھ لو کہ اس کا شہ پر (بازو) ٹوٹ گیا اور وہ محرومِ پرواز ہو گیا۔]

آرزو ہنگامہ آرائے خودی موجِ بیتابے زِ دریائے خودی

[آرزو ہی خودی کو عمل کے لیے ہنگامہ آرا کرتی ہے، اور وہ دریائے خودی کی ایک بے چین موج ہے۔]

مقصد کا تعین کر لینے کے بعد اگرچہ اس کے حصول میں بہت سے کٹھن مراحل حائل ہوتے ہیں، اس کو پا لینے کی آرزو ہی وہ محرک جذبہ ہے جو انسان کو عمل پیہم کے لیے ہر دم تیار رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ناامیدی خودی کی موت ہے اور یہی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعلیمات بھی ہیں جنہوں نے ناامیدی کو کفر قرار دیا ہے۔ اقبال خود بھی اس آرزو سے بے قرار رہتے تھے۔ اپنے بارے میں 'پیامِ مشرق' میں لکھتے ہیں:

دلِ من بے قرارِ آرزوے درونِ سینۂ من ہاے و ہوے

[میرا دل آرزو سے بے قرار رہتا ہے اور اس سے میرے سینے میں ہاو ہو کا شور بپا رہتا ہے۔]

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی کہ من با خویش دارم گفتگوے

[اے ہم نشین، مجھ سے باتوں کا کیا تقاضا کرتا ہے کہ میں تو اپنے آپ سے مصروفِ گفتگو رہتا ہوں۔]

<u>تیسرا مرحلہ: جہاد</u>: آرزو کے بعد تیسرا مرحلہ مقصد کے حصول کے لیے عمل پیہم یا جہد مسلسل کا ہے۔ یہ وہ طویل مرحلہ ہے جس میں خودی کی صحیح معنوں میں تربیت ہوتی ہے، اور یہی مرحلہ اسلام کا تصورِ جہاد ہے۔ مقصد چاہے کوئی بھی ہو اس کے حصول میں مشکلات اور دشواریاں ضرور ہوتی ہیں اور ان کے خلاف سالک کو جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران ہو سکتا ہے کہ ایسے پُرخطر لمحات آ جائیں جب انسان کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑ جائے، لیکن اس کے باوجود اس سے گریز کی کوئی گنجائش نہیں۔ اقبال کے نزدیک اس مرحلے میں دشواریوں سے تنگ آ کر خودداری پر سمجھوتہ کرنا اور عمل پیہم سے گریز کی روش اختیار کرنا خودی کی موت ہے، چنانچہ اس کے برعکس وہ سالک کو جان دے دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ 'اسرارِ خودی' میں فرماتے ہیں:

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذّتِ تخلیقِ قانونِ حیات

[دراصل زندگی کا راز عمل میں پوشیدہ ہے، اور یہی قانونِ حیات کی تخلیق کا حقیقی لطف ہے۔]

خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

[اب اٹھ اور ہمت سے ایک نئی دنیا کا خالق ہو' سینے میں شعلہ عشق اٹھا اور خلیل اللہ کا نعرہ لگا!]

با جہانِ نا مساعد ساختن ہست در میداں سپر انداختن

[ایک مخالف اور نامساعد دنیا سے مغلوب ہو جانا' گویا میدانِ جنگ میں ڈھال ہاتھ سے رکھ دینا ہے۔]

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار با مزاجِ اُو بسازَد روزگار

[ایسا انسان جو خوددار بھی ہے اور پختہ کار بھی' دنیا ضرور اس کی معاون اور مددگار ہوتی ہے۔]

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں می شود جنگ آزما با آسماں

[اور اگر دنیا اس کے مزاج و پسند کا ساتھ نہ دے' تو وہ آسمان تقدیر سے جنگ آزما ہوتا ہے۔]

برکند بنیادِ موجودات را می دہد ترکیبِ نو ذرّات را

[وہ موجودات کو اس کی جڑ سے اکھیڑ پھینکتا ہے' اور ذرات کو نئی ترتیب دے کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔]

گردشِ ایام را برہم زند! چرخِ نیلی فام را برہم زند!

[وہ گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے اور چرخ نیلی فام کا بھی شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔]

می کند از قوتِ خود آشکار روزگارِ نو کہ باشد سازگار

[وہ اپنی قوتِ تسخیر سے ایک نئی دنیا بناتا ہے' وہ دنیا جو اس کے حسبِ منشا و سازگار ہو۔]

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

[اگر دنیا میں جواں مردوں کی طرح زندہ نہیں رہا جا سکتا' تو پھر بہادروں کی طرح جان قربان کرنا ہی زندگی ہے۔]

مندرجہ بالا اشعار میں علامہ اقبال کا نظریہ تقدیر بھی وضاحت کے ساتھ آ گیا ہے' جس کی اصلاح کیے بغیر خودی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص اپنی کم ہمتی اور ناسازگار حالات کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر بیٹھ جائے تو وہ تعمیر خودی کے اس سلوک پر نہیں چل سکتا۔ اس کے برعکس اس راہ میں کامیاب وہی ہو گا جو تقدیر سے بھی جنگ آزما ہو جائے۔ اس بنا پر شاید کوئی اقبال کو 'قدریہ' جان لے۔ لیکن اقبال قدریہ کی طرح یہ نظریہ نہیں رکھتے تھے کہ تقدیر ہمیں پابند کر ہی نہیں سکتی' بلکہ ان کا اس ضمن میں نظریہ یہ ہے کہ ہم تقدیر کے پابند نہیں بلکہ اللہ کے احکامات کے پابند ہیں۔ ہاں تقدیر نے ہر حال میں ہمیں پابند کر کے رہنا ہے۔ اس ضمن میں ان کا مندرجہ ذیل شعر بہت خوبصورت ہے:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

چنانچہ تقدیر کی پابندی کرنا جانوروں اور پودوں کا کام ہے' کیونکہ ان کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں۔ لیکن انسانوں کا معاملہ یہ نہیں' ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ ''اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا'' چنانچہ تقدیر کا فیصلہ ہو یا اللہ کی نازل کردہ شریعت کا فیصلہ' ہیں دونوں اللہ ہی کے فیصلے' مگر ہم مکلّف شریعتِ الٰہی کے ہیں' تقدیر الٰہی کے نہیں۔ ہم تقدیر کے فیصلے کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب یہ شریعت کے حکم کے موافق ہو گا' ورنہ اللہ کے حکمِ شریعت سے حکمِ قدر کے خلاف لڑنے میں ہی ہماری اُخروی نجات ہے۔ علامہ اقبال اپنی مشہور نظم 'پیر و مرید' میں اپنے پیر مولانا رومی سے

جب جہاد کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں تو ان کا جواب اسی مسئلے کی وضاحت میں اس طرح آتا ہے:

اے نگہ تیری میرے دل کی کشاد　　کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد!
نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن　　بر زُجاجِ دوست سنگِ دوست زن!

[نقشِ حق (خدا) کو امرِ حق (خدا) سے توڑ دو' دوست کے آئینے کو دوست کے پتھر سے توڑ دو۔]

علامہ اس مرحلے میں ہمت اور عزم کا درس دیتے ہیں' کیونکہ اس مرحلے کو پار کرنا ان صفات کے بغیر ممکن نہیں۔

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود؟　　گر بخود محکم نہ بُودن چہ سود؟

[حیوانوں کی مانند محض کھانے اور آرام کر لینے کا کیا فائدہ؟ اور اگر تو اپنے آپ میں توانا نہیں تو زندگی کا کیا فائدہ؟]

خویش را چوں از خودی محکم کنی　　تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

[جب تو اپنے آپ کو خودی سے محکم اور توانا کر لے' پھر اگر تو چاہے تو تمام دنیا درہم برہم کر سکتا ہے۔)

گر فنا خواہی زِخود آزاد شو　　گر بقا خواہی بخود آباد شو!

[اگر تو فنا (فنا فی اللہ۔ اشارہ ہے روایتی صوفیاء کے مقصد کی طرف) چاہتا ہے تو اپنے آپ سے آزاد ہو جا' لیکن اگر تو بقا (بقاء باللہ۔ اشارہ ہے شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی مساعی کی طرف کہ انہوں نے روایتی صوفیاء کے نظریے کی اصلاح کی اور ان میں جذبہ جہاد پیدا کر دیا) چاہتا ہے تو اپنے آپ کو خوب پہچان لے!]

چیست مُردن از خودی غافل شدن　　تو چہ پنداری فراقِ جان و تن؟

[موت کیا چیز ہے؟ خودی کی ممکنات سے غافل ہو جانا' کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ موت فراقِ جان و تن کا نام ہے؟]

تربیتِ خودی کے ضمن میں جو مراحل اجمال کے ساتھ 'اسرارِ خودی' میں علامہ نے بیان کیے ہیں' اس کا پہلا مرحلہ اطاعت بھی اسی مرحلہ جہاد کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ عمل پیہم و جہد مسلسل کسی نظم کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ نے بہت خوبصورت مثالیں دی ہیں۔ چنانچہ تربیت خودی کے پہلے مرحلے یعنی اطاعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است　　پائمال از ترکِ آں گردیدہ است

[سبزہ بڑھنے پھولنے کے نظام کے تحت اُگتا ہے' اگر وہ اس نظام سے پہلو تہی کرے تو وہ پاؤں کے نیچے روندا جاتا ہے۔]

لالہ پیہم سوختن قانونِ او　　بر جُہد اندر رگِ او خونِ او

[لالہ کا آئین و دستور مسلسل جلتے رہنا ہے (سرخ رنگ کی طرف اشارہ ہے) اس کی رگوں میں اس کا خون دوڑتا رہتا ہے۔]

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل　　ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

[باہم مل جانے کے بنا پر قطرے دریا کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی باہمی ملاپ کے دستور کے سبب ذرے صحرا بن جاتے ہیں۔]

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

[ہر چیز کا باطن کسی نہ کسی آئین کی وجہ سے مضبوط اور مستحکم بنتا ہے (تو پھر) تو نے کس لیے اس پابندی اور فرماں برداری کو پس پشت ڈال رکھا ہے؟ کیوں غفلت برت رہا ہے؟]

چوتھا مرحلہ: علم و عمل: مقصد کے صحیح تعین کے بعد اس کو پا لینے کی آرزو یقیناً سالک کو اس کے لیے جستجو کرنے پر آمادہ کر لیتی ہے، لیکن اس کٹھن سفر میں جو مشکلات و مصائب حائل ہوتے ہیں ان کو پار کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر بھی کچھ درکار ہوتا ہے، اور وہ علامہ کے نزدیک یقین محکم ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس یقین کے حصول کے ذرائع اقبال کے نزدیک دو ہیں، ایک علم اور دوسرا عشق۔ ان کو اقبال عقل اور جنون سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک علم و عقل صرف ایک حد تک ہی یقین کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں، لیکن یہ اصل میں عشق و جنون ہیں جو سالک کو اس کی منزل کے بلند درجوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ علم و عقل اور عشق و جنون کا تعمیر خودی کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ کا مندرجہ ذیل شعر بہت اہم ہے:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل　　اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل!

[علم سے 'غیرتِ جبریل' تو حاصل کی جا سکتی لیکن مقصد کے حصول کے لیے اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو 'صورِ اسرافیل' کے بغیر ہٹانا ممکن نہیں۔]

اسی طرح ایک جگہ عقل کو اسی سلوک میں ایک چراغِ راہ کی حیثیت دیتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے!

چنانچہ مقصد کو پا لینے کی آرزو کے ساتھ ساتھ سالک کو علم، عقل یا فکر کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ اس سلوک کی حقانیت کے بارے میں ابتدائی مراحل میں انشراحِ صدر حاصل کر سکے۔ اگر کوئی کسی سلوک سے پوری طرح مطمئن ہی نہ ہو تو اس سلوک کے مقصد کو اپنا مقصد بنانے اور اس کے حاصل کرنے کی آرزو اور تمنا رکھنے کے باوجود بھی اس راہ میں زیادہ آگے نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ علم و فکر کو اس جستجو میں چراغِ راہ گردانتے ہیں۔

پانچواں مرحلہ: عشق و جنون: جب سالک کو علم کے ذریعے مقصد کو پا لینے کا کچھ یقین حاصل ہو جاتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اس راہ پر تندہی سے پیش رفت کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار اس کے حصول کے لیے گامزن ہو جاتا ہے۔ یہی دراصل مقامِ عشق ہے۔ یہ عشق اقبال کے نزدیک ایک بہت بڑی طاقت ہے جو بہت تیزی سے تعمیر خودی کے مراحل پار کرا دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک علم و عقل کے ذریعے حاصل کردہ یقین کے نتیجے میں سالک پر اپنا مقام واضح تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ عشق ہی ہے جو اسے اس مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں!

یہی مقصد کا عشق ہے جو بعد میں عشقِ الٰہی بن جاتا ہے۔ اصل میں محبوب سے عشق کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ کھپا دیا جائے، جس میں اس کی خوشی و رضا ہو، ورنہ تو عشق کی حیثیت ایک دعوے کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال کا تصورِ عشق روایتی صوفیاء کے تصورِ عشق سے

بہت مختلف ہے' جس میں محبوبِ حقیقی سے الحاق ہی اصل مقصد ہوتا ہے' جب کہ وہ امر جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس کی طرف توجہ نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ انہیں ان لوگوں سے محبت ہے جو اس کی راہ میں باہم مربوط ہو کر اس کے اور اس کے دین کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں' جبکہ روایتی صوفیاء خلوت گزینی' اور ترکِ دنیا میں ہی اللہ کی رضا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

''بیشک اللہ کو تو محبت ہے ان سے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اس کے بعد یہی مقصد کا عشق سالک پر رسول اکرم ﷺ کی عظمت بھی منکشف کر دیتا ہے' کیونکہ جب وہ اس راستے پر خود چل رہا ہوتا ہے اور وہ مشکلات اور مصائب جو رسول اللہ ﷺ نے جھیلی تھیں اس کو براہ راست سہنا ہے' اس کا حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کے ساتھ ایک گہرا رشتہ استوار ہو جاتا ہے' جس کا نام عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جس شخص نے اس راستے پر چل کر وہ سب مصائب اور مشکلات کا اندازہ ہی نہیں کیا جو رسولِ اکرم ﷺ نے سہے ہیں اس پر حضور ﷺ کا مقام اور مرتبہ کیسے منکشف ہو سکتا ہے اور اس کے عشقِ رسول کے دعوے کس حد تک صحیح ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ عشقِ رسولؐ سالک کے اندر اتباعِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور پھر سالک کا تعلق روحانی طور پر رسول اکرم ﷺ سے استوار ہو جاتا ہے جو اقبال کے انسانِ مطلوب ہیں۔ اقبال اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

وہ دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کل جس کے　　غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا!

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات کو ہی دین حق کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است!

[تو خود کو محمد ﷺ کے دربار میں پہنچا دے' کیونکہ دین حق وہی ہے۔ اگر تو آپ ﷺ کا مسلک اختیار نہ کر سکا تو سمجھ لے کہ باقی سب کفر ہے۔]

عشق جیسا کہ بیان ہوا ایک بہت اہم منزل ہے۔ جو سالک عشق سے سرشار ہو جاتا ہے اس کے نزدیک اس دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' بس اسے صرف اللہ کی رضا محبوب ہو جاتی ہے اور وہ اس مقصد کی خاطر جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہو' اپنا سب کچھ لگانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ عاشق پھر فرعون و نمرود جیسے سفّاک حکمرانوں سے بھی نہیں ڈرتا' حق گوئی اور بے باکی اس کا شعار بن جاتے ہیں' یہاں تک کہ موت بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رضا کی خاطر خطروں سے کھیلنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ غرضیکہ عشق وہ مرحلہ ہے کہ جب سالک اسے عبور کر لیتا ہے تو اسے فقر' دلیری' خودداری' بے باکی' فراست جیسی صفات حاصل ہو جاتی ہیں۔ علامہ ان خصوصیات کو اپنے کلام 'بالِ جبریل' میں ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ　　کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مرحلہ عشق اس سلوک کا ایک بہت اہم مرحلہ ہے جس کے بے حد مقامات ہیں۔ عشق کے ان مقامات کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود　　عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

علامہ کے نزدیک یہ عشق اسی طرح سالک کو دیوانہ وار عمل پر گامزن رکھتا ہے، یہاں تک کہ خودی ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے کہ وہ مر کر بھی نہیں مرتی اور اپنی حیات جاری رکھتی ہے، یعنی آنے والا زمانہ بھی اس کے فیض سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

اس شعر میں ایک بات توجہ طلب ہے کہ یہاں اقبال نے مردِ مؤمن کی بجائے مردِ خدا کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کا انسانِ مطلوب تو مردِ مؤمن ہے، لیکن جس شخص نے بھی دنیا میں کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دیا اقبال اس کو بھی ''عِبَادًا لَّنَا'' (بنی اسرائیل: ۵) کی روشنی میں مردِ خدا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشق چاہے کسی بھی مقصد کے ساتھ ہو مرتا نہیں ہے بلکہ اپنے اثرات دکھاتا رہتا ہے۔

چھٹا مرحلہ: یقین: انسان جتنا عشق کے بحرِ بیکراں کو عبور کرتا ہے اتنا ہی اسے اپنے مقصد کے پا لینے کا یقین نصیب ہو جاتا ہے۔ اس یقین کے پیدا ہونے کی وجہ فطرتِ حیاتِ انسانی ہے۔ جیسا کہ پہلے اشعار میں بیان ہوا مسلسل عمل پیرا رہنا زندگی کی حقیقت ہے، جب سالک اپنے مقصد کی طرف جدوجہد پر دیوانہ وار گامزن ہو جاتا ہے اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے تو اس جُہدِ مسلسل میں اسے اپنی زندگی کا احساس ہوتا ہے، اور اس کو ترک کر دینے کے تصور سے ہی اسے نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں اسے اپنے اسی احساسِ زندگی کی موت نظر آ رہی ہوتی ہے۔ اس لیے جیسے جیسے وہ اس جدوجہد میں آگے بڑھتا رہتا ہے، اسے اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ یہی حق ہے، اور اگر اس کا مقصد عقلاً اور فطرتاً صحیح ہو تو یہی یقین محکم کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اگر سالک اس مقام تک پہنچ جائے تو اس میں عزمِ مصمّم، ثابت قدمی، استقامت، جواں مردی اور ضبطِ نفس جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اقبال ایسا ہی یقین پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عمل پیہم اور یقین کے باہم تعلق کو علامہ یوں واضح کرتے ہیں:

دمادم خویش را اندر کمیں باش　　گریزاں از گماں سوئے یقیں باش
[تو ہر وقت اپنی خودی کی تحقیق اور حفاظت میں رہ، اور شک و شبہ کو چھوڑ کر یقین کی طرف بھاگ!]

عمل خواہی؟ یقیں را پختہ تر کن　　یکے جوے و یکے بین و یکے باش!
[لیکن جب عمل چاہیے تو یقین کو نہایت پختہ کر، ایک ہی نصب العین کی جستجو کر، اسی کو دیکھ اور اسی میں وقف ہو جا!]

اسی طرح علامہ کے کلام میں اس موضوع پر بے شمار اشعار ملتے ہیں:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو‘ زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!
یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں‘ نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم‘ عمل پیہم‘ محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہی وہ مقام ہے جس میں علامہ کا پیش کردہ تربیتِ خودی کا دوسرا مرحلہ یعنی ضبطِ نفس بھی پار ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس مرحلے میں سب سے بڑی رکاوٹیں خوف اور محبت ہیں۔ یعنی دنیا‘ آخرت‘ جان اور آسمانی آفتوں کا خوف اور مال و دولت‘ وطن‘ عزیز و اقارب اور عورت کی محبت۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند — با محبت خوف را آمیختند

[تیرے وجود کی تعمیر مٹی سے ہوئی ہے۔ یعنی تو آب و گل سے بنا ہے۔ اس تعمیر میں محبت اور خوف کی باہم آمیزش کی گئی ہے۔]

خوفِ دُنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں — خوفِ آلامِ زمین و آسماں

[دنیا کا خوف ہے‘ آخرت کا خوف ہے‘ جان کا خوف ہے‘ زمین اور آسمان سے نازل ہونے والی آفتوں کا خوف ہے۔]

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن — حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

[مال و دولت کی محبت اور وطن کی محبت ہے‘ اپنے عزیزوں کی محبت اور عورت کی محبت ہے۔]

ان سب کمزوریوں سے نکلنے کے لیے علامہ توحید الٰہی پر یقین کا درس دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

[جب تک تیرے ہاتھ میں ’لا الٰہ‘ (کلمہ توحید) کا عصا ہے تو خوف اور ڈر کے ہر طلسم کو توڑ کے رکھ دے گا۔]

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیشِ باطل گردنش

[جس کسی کے دل میں حق جان کی طرح موجود ہے اس کی گردن کبھی باطل کے سامنے نہیں جھک سکتی۔]

خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

[اس کے سینے میں خوف کا گزر ہو ہی نہیں سکتا‘ اس کا دل خدا کے سوا کسی شے سے نہیں ڈرتا۔]

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد

[جو شخص ’لا‘ یعنی توحید کی مملکت میں آباد ہو گیا وہ بیوی بچوں کی زنجیر سے بالکل آزاد ہو گیا۔]

می کند از ما سوئ قطعِ نظر — می نہد ساطور بر حلقِ پسر

[وہ غیر اللہ سے نظریں ہٹا لیتا ہے‘ وہ اپنے بیٹے کے حلق پر چھری رکھ دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا۔]

با یکی مثلِ ہجومِ لشکر است — جاں بچشمِ او زباد ارزاں تر است

[وہ یکہ و تنہا ہونے کے باوصف ایک بہت بڑے لشکر کی صورت ہے‘ اس کی نظروں میں اس کی جان ہوا

سے بھی کہیں سستی ہے۔]

یہاں بھی ضبطِ نفس کے مرحلے کا حاصل علامہ کے نزدیک ایک نڈر اور بیباک شخص ہے جو خوفِ الٰہی کے سوا ہر قسم کے خوف سے آزاد اور محبت الٰہی کے سوا ہر محبت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تعمیر خودی کا یہ مرحلہ بھی روایتی صوفیاء کے مرحلۂ ضبطِ نفس سے بہت مختلف ہے، جن کا مقصود اس مرحلہ سے نفیِ ذات ہوتا ہے۔ جب کسی کو اس دنیا سے سروکار ہی نہیں، تو اس کو اس میں باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کیا ضرورت ہے! اور جب وہ اس پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہی نہیں، تو اس راہ میں گردن کٹانے کا مرحلہ ظاہر ہے نہیں آسکتا۔ لیکن علامہ کا انسانِ مطلوب اس مرحلے کے بعد تنہا بھی ہو تو باطل سے ٹکر لے لیتا ہے اور اس راہ میں جان دینے سے ذرا دریغ نہیں کرتا۔ عشق کے بحرِ بیکراں کو جو جتنا عبور کر لیتا ہے وہ اتنا ہی محکم یقین پا لیتا ہے۔ اور پھر اسی یقین سے خودی سے آشنائی ہوتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ اتنا ہی اس مقام پر رسولِ اکرم ﷺ کے قریب تر پہنچ جاتا ہے جو انسانی خودی کی معراج ہیں۔ علامہ کے نزدیک دراصل خودی کا یہ وہ مقام ہے جس کی زد میں زمین، آسمان، کرسی اور عرش سب کچھ آجاتے ہیں اور یہی انسان کی حقیقت یعنی نیابت الٰہی ہے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ساتواں مرحلہ: نیابتِ الٰہی : یقین کا مرحلہ طے کرتے ہی سالک نیابتِ الٰہی پر فائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا جو جتنا عشق کے مراحل طے کرتا ہے وہ اتنا ہی محکم یقین حاصل کر لیتا ہے۔ اور جتنا یقین مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی مقام نیابتِ الٰہی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ نیابت الٰہی ایک بہت بلند مقام ہے، یہی انسان کی اصل ہے، اسی لیے وہ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا گیا۔ اس مقام کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹس کو بھیجا جاتا ہے تو ہر ایک طویل اور مشقت آمیز تربیتی مراحل سے گزرتا ہے۔ جو جتنے اچھے انداز میں ان مراحل سے گزرتا ہے وہ اتنا ہی بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ہر مقام و مرحلہ پر اس کے ماتحت کچھ سپاہی کر دیے جاتے ہیں جو اس کے حکم کی تعمیل میں ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایسا بھی ہوتا ہے جو ان مراحل کو اس انداز میں طے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ساری فوج کا چیف بننے کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے، جس کے حکم کی تعمیل میں ساری فوج آجاتی ہے۔ اگرچہ ملٹری اکیڈمی میں بھیجے جانے والے کیڈٹس میں سے ہر ایک اس مقام کو پالینے کا حق رکھتا ہے، لیکن اس کو پا وہی سکتا ہے جو اس کے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو۔ یہی معاملہ نیابتِ الٰہی کا ہے۔ فرشتے اللہ کے کارندے ہیں جو ساری کائنات کے عناصر پر تعینات ہیں۔ چنانچہ کوئی پہاڑوں کا نظام سنبھالے ہوئے ہے تو کوئی دریاؤں اور سمندروں کا، علیٰ ہذا القیاس کائنات کے تمام نظامات ان ہی فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق چلاتے ہیں۔ ان سب کا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نائب یعنی انسان کو سجدہ کرنا اس امر کی دلیل تھا کہ اس کا حکم ان سب پر چل سکتا ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ہو گا جب وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے گا۔ دنیا ایک اکیڈمی ہے جس میں انسانوں کو بھیجا جاتا ہے۔ ان کی تربیت کا ایک نظام اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعے سے

واضح کر دیا ہے۔ جوان طے شدہ مراحل سے گزرتا ہے اور جتنا بہتر انداز میں گزرتا ہے وہ اتنا ہی اعلیٰ مقام پا لیتا ہے اور اتنے ہی زیادہ فرشتے اس کے حکم کی تعمیل میں لگا دیے جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان میں سے انبیاء و رسل علیہم السلام ہی وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو بلند ترین مقامات پر فائز ہوئے' اور ان کے ماتحت بڑے بڑے فرشتے تک کر دیے گئے۔ اور وہ ہستی جو اس مقام کی معراج پر پہنچی حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے کہ جن کو فرشتوں کے سردار جبرائیلؑ بھی رپورٹ کرتے تھے۔ فرشتوں کی ماتحتی کا سب سے بڑا مظہر ان کی نصرت ہے جو اللہ کے اذن سے مشکل حالات میں انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین کو ملتی رہی۔ اس بے پناہ طاقت کو وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ کے لیے استعمال کرتے ہیں' تاکہ اسے امن کا گہوارا اور جنت فی الارض بنا سکیں۔

علامہ اس حقیقت کو غزوۂ بدر کے تناظر میں بیان کرتے ہیں جب مسلمانوں کو فرشتوں کی نصرت حاصل ہوئی تھی:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو　　اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

وہ پہلا موقع جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی خودی سے باقاعدہ آشنائی حاصل ہوئی وہ غزوۂ بدر کا موقع تھا اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ اس غیر معمولی طاقت کو اس مقام پر فائز مردانِ خدا کیسے استعمال کرتے ہیں اس کا ذکر بھی علامہ تربیت خودی کے مرحلہ نیابت الٰہی کی تفصیل میں یوں بیان کرتے ہیں:

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند　　ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

[جب وہ کائنات کی وسعتوں میں خیمہ لگا لیتا ہے تو اس پرانی بساط کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔]

فطرتش معمور و می خواہد نمود　　عالمے دیگر بیارد در وجود

[اس کی فطرت برکتوں اور اچھائیوں بھری ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ ایک نئی دنیا کے وجود میں لانے سے کرنا چاہتی ہے۔]

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کُل　　روید از کشتِ خیالِ او چو گُل

[اس کائنات جیسے سینکڑوں جہان اس کے خیالات و افکار کی کھیتی سے پھولوں کی طرح اُگتے رہتے ہیں۔]

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را　　از حرم بیروں کند اَصنام را

[وہ خام فطرت کو پختہ اور پائیدار بنا دیتا ہے' وہ حرم سے بتوں کو باہر نکال دیتا ہے۔]

نغمہ زا تارِ دل از مضرابِ او　　بہرِ حق بیداریٔ او خوابِ او

[اس کے مضراب سے دل کے ساز سے نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس کا جاگنا اور اس کا سونا سب اللہ کے لیے ہوتا ہے۔]

شیب را آموزد آہنگِ شباب　　می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

[وہ بڑھاپے کو جوانی کی لے سکھا دیتا ہے' وہ ہر چیز کو شباب کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔]

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر　　ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

[وہ بنی نوعِ انسان کے لیے خوشخبری دینے والا بھی ہے اور اسے برائی سے ڈرانے والا بھی' وہ سپاہی بھی ہوتا ہے' وہ فوج کا سپہ سالار بھی ہے اور سردار بھی۔]

سلوکِ تعمیرِ خودی اور قرآن

تعمیر خودی کے ان مراحل میں علامہ ذکر وفکر کا سرچشمہ قرآن ہی کو قرار دیتے ہیں اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہی ان کے فکر وفلسفہ کا ماخذ بھی ہے۔ چنانچہ اپنے انسانِ مطلوب یعنی بندۂ مؤمن کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

کردار میں جدت پیدا کرنے کے لیے بھی وہ قرآن میں تفکر کی دعوت دیتے ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

اسی طرح قرآن کو اپنے اندر اتارنے کی تلقین کرتے ہیں' کیونکہ اس میں وہ تاثیر ہے جو انسان کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے' اور جب وہ تبدیل ہو جاتا ہے تو سارا جہان ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اسی طرح نوجوان نسل کو قرآن خواں کی بجائے صاحب قرآن بننے کی تلقین کرتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

تعمیر خودی کا یہ سلسلہ محض ایک فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ فرد سے اجتماعیت کی طرف رخ کرتا ہے اور پھر اس اجتماعی خودی کی تعمیر کا بھی سامان فراہم کر دیتا ہے۔ یہ علامہ کا ایک اور غیر معمولی تصور ہے جسے انہوں نے 'بے خودی' سے تعبیر کیا ہے اور جس کو تفصیل سے انہوں نے 'رموزِ بے خودی' میں واضح کیا ہے۔ اس پر ان شاء اللہ اگلی قسط میں تفصیلی بات ہوگی۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر رفیع الدین' حکمتِ اقبال' ادارہ تحقیقاتِ اسلامی' اسلام آباد' ص ۵۷' ۵۸۔ ''فلسفہ خودی کائنات کا آخری فلسفہ ہے۔''

(۲) یہاں صحیح اسلامی تصوف پر تنقید کرنا مقصود نہیں بلکہ اس روایتی تصوف کے منفی اثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے جس کے ڈانڈے اصلاً فکرِ یونان سے ملتے ہیں اور جس کا مقصد سالکین کو حقیقی دنیا کے مسائل سے بے پروا کر کے محض ترکِ دنیا کا سبق دینا ہے۔

(۳) علامہ اقبال' آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں اجلاس' ۲۹ تا ۳۰ دسمبر' ۱۹۳۰ء' الٰہ آباد۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : فرقہ واریت اورانتہاپسندی کے رجحانات

مصنف : پروفیسرعبدالخالق سہریانی بلوچ

ضخامت : ۱۸۰صفحات قیمت: ۲۰۰روپے

ناشر : ایوانِ علم وادب پاکستان لاہور ملنے کا پتہ: ایوانِ علم وادب پاکستان' کندھ کوٹ (ضلع جیکب آباد) سندھ

مصنف نے دردِ دل کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے۔مسلمانوں کو وسعت زمین کے ساتھ ساتھ عددی کثرت بھی حاصل ہے اور بھرپور مادی وسائل بھی میسر ہیں۔اس کے باوجود اکثر مسلم ریاستوں کے سربراہ مغربی سامراج کی غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں۔انہیں یہ توفیق نہیں کہ آپس میں اتفاق کر کے مسلم اُمّہ کی ترقی کے لیے پروگرام مرتب کریں۔حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ یہودی اور عیسائی ہمہ وقت مسلم مخالف کارروائیوں میں لگے ہوئے ہیں۔مسلم ممالک کے سربراہان اُمت کی زبوں حالی کے اولین ذمہ دار ہیں۔وہ اپنی حیثیت سے بے شمار ذاتی فوائد اور بڑی مقدار میں دولت اکٹھی کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور عیش وعشرت میں مدہوش ہیں۔

مسلم اُمّہ کی زبوں حالی کے دوسرے ذمّہ دار علماء ہیں جو انبیاء کے وارث کہلاتے ہیں۔یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ علمائے حق سے دنیا کبھی خالی نہیں ہوئی۔لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آج ان کی بڑی تعداد کا کردار معیارِ مطلوب کے درجے کو نہیں پہنچتا۔چنانچہ ان کی وجہ سے مسلمان لاتعداد فرقوں میں منقسم ہو چکے ہیں' حالانکہ مسلمانوں کا دین ایک' نبی ایک' قرآن ایک ہے۔اکثر علماء فروعی مسائل اور بدعات کا پرچار کرتے اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کرتے ہیں۔مجتہدین کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف ان کی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ان کے اجتہادی فیصلوں میں اختلاف ہے لیکن وہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔انہوں نے اپنی تحقیق کے نتائج بیان کیے ہیں۔اب ہر مسلمان کو آزادی ہے کہ ان مسائل میں آسان فیصلے اختیار کر لے اور کسی دوسرے کو اس پر اعتراض نہ ہو' کیونکہ دین میں آسانی ہے۔خود اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے آسانی چاہتا ہے' مشکل نہیں۔مجتہدین کے اختلاف سے دین میں تنگی کے بجائے وسعت پیدا ہوتی ہے۔سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ مجتہدین نے مسلمانوں کے لیے گنجائش اور فراخی پیدا کر دی ہے۔

مصنف اختلاف اور افتراق کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اختلاف قابل برداشت بلکہ باعثِ رحمت ہے اور یہ ایک درجے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی موجود تھا' جبکہ فرقہ بندی مذموم اور قابلِ نفرت ہے۔طبائع کا اختلاف ایک فطری امر ہے اور اس سے مفر نہیں۔علماء کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو فروعی اختلافات میں نہ اُلجھائیں' بلکہ قرآن وسنت کے محکم فیصلوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ (باقی صفحہ 30 پر)

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah An-Nisa—cont...

(Ayaat 15-21)

Translator's note: *For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or disrespect the status of women.*

A Recap of verses 11 – 14:

Prior to our explanation starting from verse 15 of the Surah, let us revisit and examine, once more, the crucial notion of Inheritance that Islam as a Deen lays such great emphasis on. The late Dr. Israr Ahmed never claimed to be an 'exegete' or 'commentator' of the Qur'an in the traditional connotation of the term. Sticking to the enunciation made by the late visionary himself, we, hence, bond steadfastly to his visionary principles and limit ourselves to interpretation of the Divine Word alone. As emphasized in the previous issue, it is noteworthy that the first mention of 'Inheritance' and hence logically its first directives for the Muslim Ummah is to be found in the verses of the 22nd section (Ruku) of Surah Baqarah, which incidentally happens to precede Surah An-Nisa. The verses outline the injunctions for inheritance in the case where death catches up with a person in voyage. If the 'soon to be deceased' (by Allah's decree) is leaving some willable property or wealth for the heirs to share, he **must** make a solemn will in favor of his parents, relatives and other heirs, keeping a just and balanced proportion for his sons and daughters, allowing for any bequest that has been bequeathed, not more than a third of the willable amount, following a precise estimate of any outstanding debt owed, sans riba (interest).

Introduction to the exegesis from verses 15 through 22

In Makkah, the Muslims were a persecuted minority and there was no point of revealing verses related to how to run a state when in power. In Madinah, however, Allah gave Muslims the opportunity to promulgate laws and customs and build a moral code of conduct which would serve as an example for the generations to come. It must be noted here that the matter of dignity, honor and chastity of women is of pivotal importance in Islam. The final shape of the law was revealed in two Surahs that are placed in the latter part of the Qur'an, namely, Surah Al-Ahzab and Surah An-Noor. This is another example of the sublime Wisdom of Allah, as the verses regarding laws of inheritance were revealed progressively and kept vigil of the strongly tribal Arab culture on one hand, while removing the decadence prevalent in the pre-Islamic Arab culture on the other. We therefore first find the Divine injunctions regarding constructing a virtuous society in Surah An-Nisa, which is placed at the earlier part of the Divine Book, culminating in the two Surahs that are placed at the latter part and giving the social fabric a finishing touch in Surah Al-Maida, which again is in the earlier part of the Divine Book. The pensive reader is advised to read the earlier section of this discourse published in the previous edition of Hikmat-e-Qur'an. The Qur'an provided guidelines about how to abolish the promiscuity prevalent in pre-Islamic Arabian culture and ordained injunctions, although gradually, to convert sexual chaos into discipline and harmony.

Verses 15 and 16

وَالّٰتِيْ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝

(15) *And as for those of your women who become guilty of immoral conduct, call upon four from amongst you who have witnessed their guilt; and if these bear witness thereto, confine the guilty women to their houses until death takes them away or Allah opens for them a way [through another injunction].*

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

(16) *And punish [thus] both of the guilty parties; but if they both repent and mend their ways, leave them alone: for, behold, Allah is an acceptor of repentance, a dispenser of grace.*

Verses 15 and 16 of this Surah highlight certain measures that must be

taken in an Islamic society to achieve sexual discipline.

That nascent state of Madina, was home to at least three distinct religious communities:

1. The Muslims, both immigrants from Makkah and the local tribes of Aus and Khazraj.
2. The Pagans of Madina, who, till then, had refused to denounce their ancestral religion.
3. The Jews of Madina.

It is important to emphasize at this point that the injunctions and the consequential implications are different in the two verses.

1- **Verse 15 appears to provide hint to, but not limited to, a situation whereby a Muslim woman is found guilty of having committed fornication with a non-Muslim man.**

(Translator's note: Most traditional as well as modern commentators of the Qur'an are of the view that this verse encompasses non-Muslims too, provided that an authentic Islamic state with all its pre-requisites has been established. ***Ref***: Ma'arif-ul-Qur'an.)

If such a case occurs and then comes into limelight, then four Muslim witnesses alone (no non-Muslim witness) will be summoned to testify against or in favor of the woman. Even when the offence had been proven through the testimony of the four Muslim witnesses, being a plural society, Muslims had no legal jurisdiction against the non-Muslim culprit, say a Jew or a Christian, (provided that an authentic Islamic state with all its pre-requisites has not been established. Otherwise, the Jewish culprit will be at the receiving end of a similar punishment) and hence could not produce him before the Prophet of Allah (the court of law at that time) to hear and cross-question the witnesses and deliver his verdict. Hence, verse 15 of the Surah deals with such a Muslim woman who had committed adultery with her Non-Muslim partner with the male fornicator, a Non-Muslim, being outside the jurisdiction of the Islamic court. The verdict, pronounced by the Qur'an is that such Muslim women must now be restrained and confined to their homes, disallowing them to leave their house under any circumstance. It was sort of a 'house-arrest' ***(Translator's note: as we hear of often in today's world, imposed on those individuals whom the state has evidence enough to consider a monger of chaos and anarchy in the society on one hand and for their personal safety and protection, physical and psychological included, on the other.)*** The Qur'an says that this imprisonment of the Muslim woman found guilty of fornication with a non-Muslim must continue till either the time of her death arrives or that Allah opens another mode of punishment that would absolve her from the hellfire in the Hereafter. That mode

of punishment, in fact, arrived when this law of the Qur'an was abrogated by another mentioned in Surah an-Noor, whereby both the guilty man and woman were ordered to be flogged 100 times in public. Until the revelation of those verses of Surah An-Noor which abrogated Surah An-Nisa's law, the injunction stated in verse 15 of Surah An-Nisa was the standing order and constituted what Qur'an refers to elsewhere as the limits (or bounds) of Allah (Hudood Allah).

2- **Verse 16 appears to provide hint to, but not limited to a situation whereby a Muslim woman is found guilty of having committed fornication with a Muslim man (thus both are Muslims).**

(***Translator's note:*** Most traditional as well as modern commentators of the Qur'an are of the view that this verse encompasses the punishment prescribed for those found guilty of committing any sort of homosexuality. ***Ref:***Ma'arif-ul-Qur'an)

As both fornicators are Muslims, subject to the legal jurisdiction of the Muslim society, they would both be punished and humiliated in public for breaking the covenant with Allah and His messenger. Although, the nature of punishment and the procedure involved in the testifying of witnesses is not explicitly mentioned in this verse in a literal manner, yet it follows logically that all criminal procedures in Islam adhere to the same code of ethic and action. The question about the type of punishment to be awarded, however, naturally arises. In the opinion of most commentators, any type of Ta'azeer that would be exacting to the nature of the offence, involving physical punishment and humiliation in public are involved, may be awarded. The verse also calls for Muslims to leave the fornicators alone provided they repent sincerely to Allah after having been at the receiving end of physical punishment and humiliation.

This discourse is of academic nature now, since the law in verse 16, too, was abrogated by the injunctions revealed in Surah An-Noor. Until the revelation of those verses of Surah An-Noor which abrogated this law, the injunctions stated in verse 16 of Surah An-Nisa were the standing order and constituted what Qur'an refers to elsewhere as the limits (or bounds) of Allah (Hudood Allah). This is similar to the situation governing the laws of inheritance in Islam, whereby the later injunctions revealed in Surah An-Nisa abrogated the earlier injunction of making a will at the time of death which was revealed in Surah Al-Baqarah.

Verses 17 and 18

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

(17) Verily, Allah's acceptance of repentance relates only to those who do evil out of ignorance and then repent before their time runs out: and it is they unto whom Allah will turn again in His mercy - for Allah is all-knowing, wise;

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

(18) Whereas repentance shall not be accepted from those who do evil deeds until their dying hour and then say, "Behold, I now repent"; nor from those who die as deniers of the truth: it is these for whom We have readied grievous suffering.

Verse 17 deals with the 'Tauba' of believers, while verse 18 deals with that of the disbelievers.

Verse 17 implies that the acceptance of 'Tau'ba' is an eternal gift that Allah has bestowed on his bondsmen. Most commentators of the Qur'an agree that due to the presence of Satan seducing the 'Nafs-e-Ammara' (negative self or Id) towards worldly gains and pleasures, many 'Ibad' of Allah commit sins out of either ignorance or a sudden rush of adrenaline. The latter occurs when emotions overtake rational thought and remembrance of the consequences of doing that sin in the Hereafter. However, emotions, being temporary in nature, eventually fade away and are ultimately replaced by remorse and the senses of good and evil return, which is its vulgar form, is a sense of guilt. Such 'Ibad', then, immediately turn towards Allah filled with remorse for whatever sin they have committed and plead to Allah for forgiveness and repentance, just like a bike rider falling off his bike on a rainy day while taking a dangerous curve on a slippery road immediately gets up to his feet and continues his journey. Similarly, such 'Ibad' do not delay in turning their face to Allah and surely the Merciful , the All-Knowing and All-Wise reciprocates with His infinite munificence and compassion by forgiving their sin(s), albeit from an esteemed position and nature that is worthy of Him alone, incomparable to any act of benevolence, mercy, compassion and even 'Tau'ba' enacted by His 'Ibad'. Whenever we commit a sin and transgress the limits of Allah and His Messenger, we must immediately turn towards the 'Tawwab' (The Forgiver) to be considered as one of the 'Tawwaboon' (repenting ones).

Verse 18 however, warns that this repentance is exclusive for Muslimun and Muminun alone and it is does not wrap the sins of

unbelievers, nor of hypocrites. Till that horrifying moment of truth arrives when the angel of death approaches to reap their souls. When they see the absolute Truth with their very eyes, they then declare faith in Allah and plead for repentance and beg for forgiveness. But the window of opportunity is now closed and the door of repentance is shut on them forever!

The important lesson for us Muslims is that we ought to make 'Tau'ba' at the earliest. Being a Muslim is a legal issue, but if that 'Muslim' is repeatedly committing grave sins, flouting the laws of Shariah, transgressing the limits of Allah and His messenger without a tittle of remorse, then what guarantee does he have not be treated in the same way as disbelievers and hypocrits are at the time of his death. The fact is that whosoever dies as a disbeliever in the eyes of Allah has no option open for Tauba for him. For such persons, the verse says, Allah has prepared a punishment, a chastisement, which is excruciating and humiliating, simultanuously.

Verses 19, 20 and 21

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ
يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝

(19) *O YOU who have attained faith! It is not lawful for you to [try to] become heirs to your wives [by holding onto them] against their will; and neither shall you keep them under constraint with a view to taking away anything of what you may have given them, unless it be that they have become guilty, in an obvious manner, of immoral conduct.And consort with your wives in a goodly manner; for if you dislike them, it may well be that you dislike something which Allah might yet make a source of abundant good.*

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

(20) *But if you desire to give up a wife and to take another in her stead, do not take away anything of what you have given the first one, however much it may have been. Would you, perchance, take it away by slandering her and thus committing a manifest sin?*

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝

(21) *And how could you take it away after you have given yourselves to one another, and she has received a most solemn pledge from you?*

Verse 19 deals with a common custom prevalent among the pre-Islamic Arabs that a son inherited the wives of his deceased father. It so happened, in pre-Islamic Arab culture, that when the father died, his sole son would 'inherit' the rest of his father's wives as his own. The women had no choice in this matter as it was a categorical custom, a norm and a part of that culture. As they were treated like any inheritable property, the inheritor could then do whatever he wanted with his stepmothers (now wives). The Qur'an, in very categorical terms, denounced this act (**Translator's note:** which would put anyone with any degree of decency to shame) and declared that the believers are not permitted to take women as inheritance or to marry their own step-mothers.

Moreover, the mischief was multiplied manifold with the general mistreatment and the absolute financial slavery of married women. It so happened at times, including the case explained above, that when a man married a woman, he 'gave' her a large sum of wealth, mostly gold, as Mehr (bridal money), with the intention of using it for blackmail or as ransom, later. When the proverbial 'honeymoon period' was over, he would start persecuting and torturing her, both physically and mentally, and treating her as a slave, knowing well that the wife would not dare ask for a divorce from the fear of losing the insurmountable 'bridal money' hanging around her neck. In the same verse the Qur'an also prohibitsthe husband to demand for even a single penny of the 'bridal money' given to his wife at the time of marriage, be it 'heaps of gold'. The Mehr was thus declared to be the belongings of the wife and her husband had no right whatsoever to demand back any part of it. (**Translator's note:** If the wife, however, offered him some or all of her Mehr willingly and without coercion, her husband could accept it.)

The only instance where the Qur'an condones physical punishment awarded to a woman is when she is proven beyond doubt in a court of law backed by the testimony of four righteous witnesses to have committed adultery. It must be investigated that the husband is not using the case against his wife as a way to trap for her Mehr.

The Qur'an for the first time in human history set certain guidelines and parameters that would govern the social lives of human beings and their dealings with each other. It assertively advised husbands and wives to live in an honorable way and be patient towards and considerate of each other. The Qur'an metaphorically explains that

Allah may have earmarked some good for you in a wife whom you dislike at times to the extent of hatred by subtly directing the attention of the reader (or listener) to the fact that a human personality consists of innumerable traits and simply disliking one trait could cause the eyes (and heart) of the husband to be blindfolded from the various other noble ones that she possesses. (**Translator's note:** A 'Muasharat' that protects the rights of women as professed by Islam about 1400 years ago still seems to surpass even the most 'liberal' of women's rights laws promulgated today!).

Verse 20 expounds that despite all efforts to maintain a lovable and working relationship between a man and his wife; at times it simply does not function and may become counterproductive for boththe spouses and their offspring. The Qur'an calls the Mehr given at the time of marriage as the 'property and possession' of the wife. The Qur'an declares that if a divorce does occur then the husband is not entitled to demand back any part of the Mehr given to his wife at the time of marriage, be it 'heaps of gold'. Trying to do so either by verbal slandering, societal pressure or physical coercion is a grave and manifest sin in the eyes of Allah.

While verse 20 allows divorce as a measure of last resort, verse 21 explains the rationale behind this injunction. The essence of marriage is that solemn pledge – that solemn covenant that which is extremely sacred in the eyes of Allah and that makes two strangers of the opposite sex bond together and become halal for sexual intercourse, which is far nobler than wealth or any other material gain. In such spiritual relations, where each is the 'dress' of the other, petty issues like the amount of Mehr should not cause much ripples. Sanity and reason must prevail and husbands in such cases should behave with nobleness. Neither does the sublime nature of the physical companionship with the wife befit that the husband should keep plotting to find ways and ploys to get the 'bridal money' back from his wives. Allah views Nikah a very sacred covenant and a very sacred agreement. At the time of Nikah, the husband vows to take care of all the needs for sustenance of his wife. The relationship between the spouses is so closely knit and intense that Allah uses the Arabic phrase 'Meesaq-e-Ghaliza' (A firm and resolute covenant between the two) to describe it at the culmination of verse 21 of the Surah.

بیسویں صدی عیسوی

میں صنم کدۂ ہند میں "احیائے اسلام" کی کوششوں پر ایک اہم تاریخی دستاویز

جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی

- ابوالکلامؒ 'امام الہند' کیوں نہ بن سکے؟
- 'حزب اللہ' اور 'دارالارشاد' قائم کرنے کے منصوبے بنانے والا "عبقریٔ وقت" کانگرس کی نذر کیوں ہو گیا؟
- احیائے دین اور احیائے علم کی تحریکوں سے علماء کی بدظنی کیوں؟
- کیا اقامتِ دین کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے؟
- حضرت شیخ الہندؒ کیا کیا حسرتیں لے کر اِس دنیا سے رُخصت ہوئے؟

علماءِ کرام اب بھی 'متّحد' ہو جائیں تو 'اسلامی انقلاب' کی منزل دُور نہیں!

- فرائضِ دینی کا جامع تصوّر
- رجم
- عورت کی دیت

اور دیگر مسائل پر

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی معرکۃ الآرا تحریروں اور خطبات کے علاوہ مؤرّخِ اسلام مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، مولانا افتخار احمد فریدی، مہاجرِ کابل قاری حمید انصاری، پروفیسر محمد اسلم، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا محمد زکریا، مولانا سیّد عنایت اللہ شاہ بخاری اور دیگر نامور علماءِ کرام اور اہلِ علم حضرات کی تحریروں پر مشتمل تاریخی مرقع

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مبسوط مقدّمے کے ساتھ

یہ کتاب کچھ عرصے سے آؤٹ آف پرنٹ تھی۔ اب اس کا نیا ایڈیشن جدید کمپیوٹر کمپوزنگ، خوبصورت ٹائٹل اور مضبوط جلد کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا ہے!

ضخامت 620 صفحات قیمت 500 روپے

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501(042)

فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Quarterly **HIKMAT-E-QURAN** Lahore
Oct-Dec. 2013 Vol. 32 No. 4

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــ اور ـــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــ اور ـــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـ اور ـ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ